استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

خاتمیت

(ختمِ نبوت اور دینِ اسلام کی جاودانگی کے بارے میں دلکش تقاریر)

دار الثقلین

خاتمیت

(ختمِ نبوت اور دین اسلام کی جاویدانی کے بارے میں دلکش تقاریر)

تالیف

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

یکے از مطبوعاتِ

دارالثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳-کراچی ۷۴۶۰۰-پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

DARUSSAQLAIN
P.O. Box No. 2133,
Karachi-74600 Pakistan

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نامِ کتاب: خاتمیت

تالیف: استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ: سید سعید حیدر زیدی

ناشر: دارالثقلین

طبع اوّل: شوال ۱۴۳۱ھ ستمبر ۲۰۱۰ء

قیمت: ۱۰۰ روپے

فہرست

عرضِ ناشر ــــــــ ۷

پہلا خطاب: خاتمیت قرآن وحدیث میں

۹ـ۲۴

خاتمیت قرآن میں ــــــــ ۱۱

''خاتم'' کے لغوی معنی ــــــــ ۱۵

حضرت علیؑ کا کلام ــــــــ ۱۹

دوسرا خطاب: علم اور عقل تبلیغی نبوت کے جانشین

۲۵ـ۳۹

جبلی ہدایت اور عقلی ہدایت کے درمیان معکوس رابطہ ــــــــ ۳۱

بلوغ یا ختمِ نبوت کی علامت ــــــــ ۳۴

الہام کا باب بند نہیں ہوا ہے ــــــــ ۳۶

رسول اور نبی ــــــــ ۳۹

تیسرا خطاب: نبوتِ تشریعی کے خاتمے کا فلسفہ

۴۳ـ۶۴

شیعہ نقطۂ ... سے ... ورت اما ... کے بارے۔ شہ ــــــــ ۴۶

قرآن کی نظر میں انبیا کو بھیجنے کا مقصد ——— ۴۸
تمدن کے ادوار سے شریعتوں کے منسوخ ہونے کا تعلق ——— ۵۳
طیبات کے حلال اور خبائث کے حرام ہونے کا اصول ——— ۵۷
غلامی کا مسئلہ ——— ۵۹

چوتھا خطاب: اسلامی تعلیمات اور لا متناہی مقاصد

۶۵_۸۲

وحی سے تعلق رکھنے والے مسائل لا متناہی نہیں ہیں ——— ۶۸
اسلامی تعلیمات کے زندہ رہنے کا راز ——— ۶۹
اضافۂ آبادی ——— ۷۴
اسلام نفسانی خواہشات کا مخالف ہے زمانے کے ضروری تقاضوں کا نہیں ——— ۸۰

پانچواں خطاب: جبرِ تاریخ اور اسلام کی جاویدانی

۸۳_۹۸

خاتمیت اور جبرِ تاریخ ——— ۸۶
سماج اور تاریخ کا منظم اور قطعی قانون ——— ۸۹
جبرِ تاریخ اور جاویدانگی ——— ۹۴
مارکسزم کی غلط فہمی ——— ۹۷

چھٹا خطاب: دینِ خاتم میں علما کا کردار

۹۹_۱۱۴

علما کی دو بڑی ذمے داریاں ——— ۱۰۲
دینِ خاتم میں علما کی ضرورت ——— ۱۰۴
بعض ادیان میں علمائے دین کے منفی پہلو ——— ۱۰۵
جماعت کی امامت ——— ۱۰۹

استخارہ ۱۰۹
میرزا قمی کے شاہنامہ پڑھنے کا واقعہ ۱۱۰
عجیب وغریب سوالات ۱۱۲

ساتواں خطاب: غیر صاحب شریعت انبیا کے جانشین علما کی صفات

۱۱۵_۱۳۶

علما کی معاش کا مسئلہ ۱۱۷
علمائے دین کے بارے میں اسلام کے مثبت احکام ۱۲۱
وہ علما جو غیر صاحب شریعت انبیا کے جانشین ہیں ۱۲۶
اجتہاد کی دو اقسام: قیاسی اور غیر قیاسی ۱۲۷
کلیات وقواعد محدود ہیں اور مسائل لامحدود ۱۲۸
علم کے فرض ہونے کی مثال ۱۳۱
علم کے واجب ہونے کے بارے میں غزالی کا خوبصورت قول ۱۳۲
اسلام کے ہر دور پر منطبق ہونے کی نوعیت ۱۳۴

آٹھواں خطاب: ارکانِ خاتمیت

۱۳۷_۱۵۲

خاتمیت کا پہلا رکن: انسان اور معاشرہ ۱۳۹
انسان متغیر ہے لیکن ایک ثابت مدار کا مالک ہے ۱۴۰
دوسرا رکن: اسلامی قانون سازی کی خاص نوعیت ۱۴۲
تیسرا رکن: علم اور اجتہاد ۱۴۲
چوتھا رکن: تفقہ اور اجتہاد کے موضوعات کی خاص کیفیت ۱۴۳
طبیعت کا مطالعہ لامتناہی ہے ۱۴۴
طبیعت سے قرآن کی مشابہت ۱۴۷

قرآن کا سدا بہار ہونا حدیث کی روشنی میں ——— ۱۴۸

نواں خطاب: قرآن وسنت کی لامتناہی استعداد

۱۶۸_۱۵۳

صدی بہ صدی قرآن کی بہتر تفسیر کی گئی ہے ——— ۱۵۶

سنت کی لامتناہی استعداد ——— ۱۶۰

حدیث لاضرر ——— ۱۶۴

غرری لین دین کی ممانعت ——— ۱۶۵

دسواں خطاب: منابع اسلامی کی لامتناہی صلاحیت

۱۸۴_۱۶۹

ابوحنیفہ اور اعمش کی داستان ——— ۱۷۱

فلسفے اور سائنس میں قرآن کا تدریجاً بڑھتا ہوا نفوذ ——— ۱۷۲

قرآن اور توحید ——— ۱۷۳

قرآن اور حقوق نسواں ——— ۱۷۴

قرآن اور گزشتگان کی تاریخ وقصص ——— ۱۷۵

قرآن اور اخلاق ——— ۱۷۵

نہج البلاغہ اور اس کا اپنے زمانے سے آگے ہونا ——— ۱۷۷

توحید کے دلائل اور قرآن ——— ۱۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب خاتمیت کے موضوع پر استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ کی اُن دس تقاریر پر مشتمل ہے، جو انہوں نے تقریباً ۱۹۶۹ء میں حسینیہ ارشاد تہران میں کی تھیں۔ یہ تقاریر کیسٹس سے کاغذ پر نقل کر کے استاد مطہریؒ کے حوالے کر دی گئی تھیں اور انہوں نے اپنی زندگی ہی میں ان کی اصلاح اور ان میں اضافے فرما دیے تھے۔

استاد شہید مطہریؒ کی کتب کا مطالعہ کرنے والے اکثر قارئین جانتے ہیں کہ ''ختمِ نبوت'' کے عنوان سے اُن کا ایک مقالہ ایک مختصر کتاب کی صورت میں اردو زبان میں بھی دستیاب ہے، یہ مقالہ دراصل ان دس تقاریر ہی کا خلاصہ ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ دس تقاریر اسی مختصر کتاب کی شرح ہیں۔ مزید یہ کہ ان تقاریر میں ایسے نکات بھی موجود ہیں جو اس مقالے میں نہیں اور مزید ایک فرق یہ بھی ہے کہ کیونکہ یہ گفتگو تقاریر کی صورت میں ایک اجتماع کے سامنے کی گئی لہٰذا اس کا بیان نسبتاً سادہ ہے اور جگہ جگہ نکات کو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے، لہٰذا یہ اُس کتاب سے مختلف ہے۔

ان تقاریر کے ترجمے کے دوران بھی ہر ممکن احتیاط سے کام لیا گیا ہے، تاکہ کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ یہیں ہم حجت الاسلام شاہد رضا کاشفی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں، جنہوں نے بعض فقہی و فلسفی اصطلاحات کے ترجمے میں ہماری رہنمائی فرمائی۔ خدا ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

امید ہے یہ کتاب بھی اسلامی کتب کے سرمائے میں ایک اور شاندار اضافہ ثابت ہوگی۔

پہلا خطاب

خاتمیت قرآن وحدیث میں

پہلا خطاب

خاتمیت قرآن وحدیث میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.... اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

" مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ. "(۱)

پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ختمِ نبوت کا عنوان' ایک ایسا عنوان ہے جو خود قرآنِ کریم نے آپ کو عطا کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے آپ کو خَاتَمَ النَّبِيّٖن کے لقب سے پکارا ہے' اور اس بارے میں کسی مسلمان کو کوئی شک وشبہ نہیں۔

کسی مسلمان کے ذہن میں ایسا سوال اٹھ ہی نہیں سکتا کہ ہمارے نبیؐ کے بعد کوئی اور نبی ہے یا نہیں؟

یہ تصور کہ ہمارے پیغمبرؐ کے بعد اس دنیا میں کوئی اور پیغمبر آئے گا' آنحضرت کی رسالت پر ایمان کے منافی ہے۔ اگر آپ اس قسم کا تصور کرنا چاہتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ میں رسولِ اکرم کی نبوت پر ایمان رکھتا ہوں' اسکے باوجود اگر آپ احتمال کے طور پر بھی یہ کہیں کہ شاید ان کے بعد کوئی دوسرا پیغمبر آیا تھا' یا آئے گا' تو آپ کا یہ "شاید" کہنا آنحضرت کی رسالت پر ایمان کے منافی

ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ پیغمبر اسلامؐ اور قرآن پر ایمان نہیں رکھتے۔

یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں قرآن پر تو ایمان رکھتا ہوں، مگر توحید اور خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ کہتے ہیں کہ یہ تناقض (contradiction) ہے، کیونکہ قرآن کتاب توحید ہے، اور اس پر ایمان خدا کی وحدانیت پر ایمان کے مترادف ہے۔ یا اگر کوئی یہ کہے کہ میں قرآن پر تو ایمان رکھتا ہوں، مگر معاد (عالم آخرت) پر یقین نہیں رکھتا، تو یہ بھی تناقض ہے۔ کیونکہ قرآن کریم عقیدۂ معاد اور قیامت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔

خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کا موضوع بھی اسی طرح ہے۔ باوجود یہ کہ اس پر قرآنی نص موجود ہے، لیکن اگر بالفرض یہ قرآنی نص نہ بھی ہوتی، تب بھی یہ دین مقدس اسلام کی ضروریات میں سے ہے۔ لہٰذا کسی بھی مسلمان کے سامنے کسی صورت یہ سوال نہیں اٹھتا کہ ہمارے پیغمبرؐ کے بعد کوئی پیغمبر آئے گا یا نہیں۔

لیکن اسکے باوجود اگر کوئی مسلمان شخص یہ چاہتا ہے کہ اس بارے میں گہرا فہم حاصل کرے اور اس کا یہ ایمان ایک مضبوط دلیل کی بنیاد پر قائم ہو، تو وہ اس مسئلے کے اطراف و جوانب پر سوچ بچار کر سکتا ہے اور اس قرآنی فلسفے کے بارے میں غور و فکر کر سکتا ہے کہ: دنیا میں کیوں کچھ انبیا تشریف لائے، اور کیوں ایک معین مقام پر پہنچنے کے بعد سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا؟ قرآن نے اسے کس اصول اور بنیاد پر بیان کیا ہے؟

البتہ یہ قرآنی معارف میں سے ہے، اور اگر انسان ان نکات سے واقف ہو جائے جنہیں اس بارے میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے، تو اسکے علم میں اضافہ ہوگا۔

اب ہم اس بارے میں موجود ایک ایک آیت کا آپ کے سامنے ترجمہ کر کے اسکی مختصر تفسیر کریں گے، اور جن نکات کو آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے بتدریج ان کی وضاحت کریں گے۔

خاتمیت قرآن میں

ہم نے (گفتگو کے آغاز میں) جس آیت کی تلاوت کی ہے، وہ سورۂ احزاب میں ہے۔ پروردگار عالم فرماتا ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَ

النّبِيّین. محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ یعنی تم میں سے کسی کے منہ بولے باپ نہیں ہیں' انہیں اس صفت سے نہ پکارو۔ وہ صفت جس سے تمہیں انہیں پکارنا چاہیے اور اسی سے انہیں پہچاننا چاہیے' وہ یہ ہے کہ وہ خدا کے رسول اور خاتم الانبیا ہیں۔

ممکن ہے آپ پوچھیں کہ اس پہلے جملے کے کیا معنی ہیں کہ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں' کسی کے منہ بولے باپ نہیں' یہ ممانعت کس بارے میں ہے؟

یہ آیت درحقیقت ایک قدیم رسم منسوخ کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے' جو اس دور کے عرب اور غیر عرب معاشروں میں' حتیٰ ہمارے ایرانی معاشرے میں بھی موجود تھی۔ رسم یہ تھی کہ کوئی کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیتا تھا اور اسے اپنے حقیقی بیٹے ہی کی طرح سمجھتا تھا' اور اس دور کے رسوم ورواج کے مطابق جب کوئی کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیتا' تو وہ احکام اور آثار کے لحاظ سے بعینہ اسکے اپنے سگے بیٹے کی طرح ہوتا تھا۔ یعنی جس طرح اسکے مرنے کے بعد اس کا حقیقی بیٹا اس کا وارث بنتا ہے' اسی طرح یہ منہ بولا بیٹا بھی اس سے وراثت پاتا تھا۔ اسی طرح جیسے اسکے حقیقی بیٹے کی بیوی اسکی بہو شمار ہوتی تھی' اسکی محرم شمار ہوتی تھی' اور حتیٰ اسکے بیٹے کے طلاق دینے کے بعد وہ اسکی مطلقہ سے عقد نہیں کرسکتا تھا' اس منہ بولے بیٹے کی بیوی بھی اسکے لیے ایسی ہی ہوتی تھی۔

عرب میں یہ رسم عام تھی' اور عربوں کے علاوہ دوسرے معاشروں میں' بالخصوص ایران میں یہ رسم انتہائی وسیع پیمانے پر اور مزید پیچیدہ تر صورت میں موجود تھی۔ اسلام نے اس قانون کو منسوخ کیا اور فرمایا: منہ بولا بیٹا بنالینا کسی بات کا سبب نہیں بنتا۔ نہ ہی یہ بیٹا اس باپ سے وراثت لے سکتا ہے' اور نہ ہی باپ اپنے منہ بولے بیٹے سے وراثت پاسکتا ہے۔ نہ وہ بیٹا مثلاً اس باپ کی بیوی یا اسکی بیٹیوں کا محرم ہوتا ہے' اور نہ اسکی بیوی اسکی بیوی ہونے کے ناطے اس باپ کی محرم ہوسکتی ہے۔

زید بن حارثہ اسلام سے پہلے حضرت خدیجہؑ کے غلام تھے۔ حضرت خدیجہؑ نے انہیں پیغمبرؐ کو بخش دیا۔ رسولِ گرامیؐ نے انہیں آزاد کردیا۔ زید بن حارثہ ایک بہت بزرگوار انسان تھے۔ دورِ اسلام میں بھی انہوں نے بہت سی عظمتیں اور فضیلتیں حاصل کیں اور جنگِ موتہ میں حضرت جعفر بن ابی طالبؑ کے ہمراہ شہید ہوئے۔

انہوں نے اسلام قبول کیا' اور ظاہراً آپ اسلام قبول کرنے والے دوسرے مرد تھے۔ یعنی حضرت علیؑ کے بعد آنحضرتؐ پر ایمان لانے والے پہلے مرد یہی زید بن حارثہ تھے' جنہیں رسولِ مقبولؐ نے آزاد کر دیا تھا۔ یہ پیغمبرؐ پر ایک عجیب انداز کا ایمان اور آپؐ سے ایک خاص طرح کی محبت رکھتے تھے۔ حد یہ تھی کہ جب ان کے والدین کو پتا چلا کہ ان کا بیٹا آزاد ہو گیا ہے' تو وہ انہیں اپنے ساتھ لیجانے کے لیے آئے۔ رسولِ کریمؐ نے بھی انہیں چھوڑ دیا اور فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے' اگر تم اپنے والدین کے ساتھ جانا چاہتے ہو' تو چلے جاؤ۔ ان کے والدین نے ہر کوشش کر ڈالی کہ وہ ان کے ساتھ واپس لوٹ جائیں' مگر وہ جانے کے لیے تیار نہ ہوئے' اور یہی کہتے رہے میں واپس نہیں جاؤں گا' اس گھر کو نہیں چھوڑوں گا۔

زید بن حارثہ کو لوگ آنحضرت کا منہ بولا بیٹا کہا کرتے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے خاص طور پر اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنتِ جحش کو ان کے عقد میں دیا۔ یہ خود ایک بہت مشہور داستان ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے کسی کو زینب بنتِ جحش کے پاس خواستگاری کے لیے بھیجا' پہلے تو وہ سمجھیں کہ خود پیغمبرؐ اپنے لیے اُن کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔ اُنہوں نے اور اُن کے بھائی عبداللہ بن جحش نے انتہائی خوشی اور مسرت کے ساتھ مثبت جواب دیا۔ لیکن بعد میں جب انہیں پتا چلا کہ آنحضرتؐ نے اپنے آزاد کردہ غلام کے لیے اُن کا رشتہ طلب کیا ہے' تو انہیں بہت ناگوار گزرا اور وہ غصے میں آ گئیں اور کہنے لگیں کہ میں تو سمجھی تھی کہ خود پیغمبرؐ نے مجھے اپنے ساتھ عقد کا پیغام بھیجا ہے' میں عبدالمطلب کی نواسی اور قریش سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون' بھلا ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی بنوں؟! یہ میرے مقام اور مرتبے کے منافی ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے انہیں پیغام بھیجا کہ اسلام نے ایسی نخوتوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ زید ایک مومن' مسلمان اور صاحبِ ایمان فرد ہیں' مسلم کا کفو مسلم اور مومن کا کفو مومن ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ زینب نے کہا: اگر آپؐ واقعاً یہ چاہتے ہیں کہ میں زید سے شادی کروں' تو میں تیار ہوں۔ آنحضرتؐ نے ان کے اس فیصلے پر انہیں سراہا' اور پیغمبر کی خواہش پر انہوں نے زید کے ساتھ شادی کر لی۔

کیونکہ وہ شروع ہی سے زید کو پسند نہیں کرتی تھیں' لہٰذا آخر تک ان کے دل میں ان سے محبت پیدا نہ ہو سکی' اور وہ مسلسل ان سے بداخلاقی سے پیش آتی رہیں۔ زید رسول کریمؐ کے پاس آتے اور زینب کے طرزِ عمل کی شکایت کرتے' اور آنحضرتؐ سے انہیں طلاق دینے کی اجازت طلب کرتے۔ پیغمبرؐ انہیں منع فرماتے' یہاں تک کہ آخر کار زید نے انہیں طلاق دے دی' اور پیغمبرؐ نے ان سے شادی کر لی۔

یہ وہی داستان ہے جس کی بنیاد پر عیسائی پادریوں نے خوب ہنگامہ مچایا ہے اور کہا ہے کہ {نعوذ باللہ} ایک دن پیغمبر اسلامؐ اپنے ایک صحابی کے گھر میں داخل ہوئے' اسکے گھر میں اسکی انتہائی حسین و جمیل بیوی موجود تھی۔ اور کیونکہ پیغمبر بغیر اطلاع کے اچانک اس گھر میں داخل ہوئے تھے' لہٰذا آپؐ نے اس عورت کا حسن و جمال دیکھ لیا۔ آپ واپس آ گئے لیکن آپ کے دل میں اس عورت کی محبت پیدا ہو چکی تھی۔ بعد میں جب اس عورت کے شوہر کو پتا چلا کہ پیغمبرؐ اس عورت سے محبت کرتے ہیں' تو اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی!

یہ محض ایک افسانہ ہے۔ زینب آنحضرت کی پھوپھی زاد تھیں' کوئی اجنبی عورت نہ تھیں' جسے پیغمبرؐ نے نہ دیکھا ہو اور اسے نہ جانتے ہوں۔ مکہ ایک دیہات یا ایک قصبہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں وہاں پردہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ قرآن میں سورۂ نور میں موجود پردے کی آیت: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ .... (۱) مدینے میں نازل ہوئی۔

حضرت زینب کے بچپن سے جوانی تک' یعنی پیغمبر کی جانب سے اپنے آزاد کردہ غلام کے لیے اُن کا رشتہ طلب کرنے تک' اُس دور کے عرب ماحول کے معمول کے مطابق کم ہی دن ایسے رہے ہوں گے جن میں پیغمبرؐ کا اپنی اس پھوپھی زاد سے سامنا نہ ہوا ہو۔ اُس وقت تو (نعوذ باللہ) پیغمبرؐ اُن خاتون کے عشق میں مبتلا نہ ہوئے' لیکن جب اُنہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اُن کی شادی کر دی' اور اس شادی کو بھی کئی برس گزر گئے' اور اُن کے یہاں اولاد بھی ہو گئی' تب اسکے بعد اچانک آپ نے انہیں دیکھا اور اُن پر فریفتہ ہو گئے! {استغفر اللہ}

۱۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۰ {مومنین سے کہہ دیجیے کہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں۔۔۔۔}

زینب کے ساتھ پیغمبرؐ نے اس لیے شادی کی تا کہ اس طرح عملی طور پر اس رسم کو منسوخ کردیں جو تمام انسانی معاشروں میں جڑ پکڑ چکی تھی۔ جاہلیت میں زندگی بسر کرنے والے عربوں کی نظر میں پیغمبر کا یہ فعل انتہائی ناگوار تھا کہ انہوں نے اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کی ہے۔ اُس زمانے میں پیغمبر کا زینب سے عقد کرنا لوگوں کی نظر میں ایک ناپسندیدہ فعل تھا، لیکن اس وجہ سے نہیں جسے حال ہی میں پادریوں نے گھڑا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ کیا کوئی شخص اپنی اس بہو سے شادی کرسکتا ہے جسے اسکے منہ بولے بیٹے نے طلاق دی ہو؟!

قرآن کریم نے یہ رسم منسوخ کی ہے، اور آیت کے پہلے جملے میں یہی حقیقت پیش نظر ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ ..... ''محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔'' ان الفاظ سے کیا مراد ہے؟! وہ صرف اپنی اولاد کے والد ہیں، کسی غیر شخص کے والد نہیں ہیں۔ تم انہیں اس صفت سے نہ پہچانو، اور انہیں اس صفت سے خطاب نہ کرو۔ انہیں ابوزید نہ کہو، اور زید کو ابن رسول اللہ نہ کہو، بلکہ آنحضرت کو رسول اللہ اور خاتم النبیین کی صفت سے پہچانو۔ البتہ تمام ہی پیغمبر، خدا کے پیغمبر تھے، لیکن آنحضرت کو ایک خاص اور علیحدہ صفت حاصل ہے، آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ تمام انبیا کے خاتم ہیں۔

''خاتم'' کے کیا معنی ہیں؟

''خاتم'' کے لغوی معنی

عربی لغت میں لفظ ''خاتم'' کے ہم وزن صرف چند ہی الفاظ ملتے ہیں، جیسے طابَع، حاتَم اور چند دوسرے الفاظ۔ یہ سب کے سب آلات وابزار کے معنی دیتے ہیں۔ خاتم یعنی مایُختَمُ بِهٖ، طابَع یعنی مایُطبَعُ بِهٖ۔ ''مایُختَمُ بِهٖ'' یعنی ایسی چیز جس کے ذریعے کسی چیز کا اختتام کیا جائے۔ اس آیت کو زمانہ قدیم سے قرأسبعہ (۱) نے خاتِمَ النَّبِيِّينَ بھی پڑھا ہے اور خاتَمَ النَّبِيِّينَ بھی۔

۱۔ صحابہ اور تابعین کے بعد قاریانِ قرآن کے ایک گروہ کو دوسرے قرأ کی نسبت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان سات قاریانِ قرآن کو جن میں سے بعض تابعین اور بعض تبع تابعین میں سے تھے، قرأسبعہ کہا جاتا ہے۔ ان قرأ کے نام ہیں: نافع بن ابی نعیم مدنی، عبداللہ بن کثیر مکی، عاصم بن ابی النجود کوفی، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

صرف ''عاصم'' نے اسے خاتَم النّبیّن پڑھا ہے' جبکہ اسکے علاوہ سب نے خاتِم النّبیّن ہی پڑھا ہے۔ اگر ہم قرآن کے کسی لفظ کو دو طرح سے پڑھیں اور دونوں طرح سے پڑھنا صحیح بھی ہو' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اگر ہم خاتِم النّبیّن پڑھیں تو اسکے معنی سادہ اور واضح ہیں' یعنی انبیا کا اختتام کرنے والا۔ ''خاتِم'' اسمِ فاعل ہے' جو ''کرنے والا'' کے معنی دیتا ہے۔ خاتِم النّبیّن' یعنی سلسلۂ انبیا کا خاتمہ کرنے والا۔ البتہ ''خاتَم'' اسی مذکورہ معنی اور مفہوم کے علاوہ ایک اضافی مفہوم بھی دیتا ہے اور یہ اضافی مفہوم یہ ہے کہ یہاں رسالت اور نبوت کے موضوع کو ایک خط (letter) سے تشبیہ دی گئی ہے' جو ایک مقام پر جا کے ختم ہو جاتا ہے' اور خط لکھنے والا اسے ختم کر کے اسکے نیچے اپنی مہر لگاتا ہے اور اس مہر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خط کا اختتام ہو چکا ہے۔ پس اس کا مفہوم اختتام کرنا ہے۔ اس مفہوم میں ایک اضافہ بھی ہے' جو یہ ہے کہ یہ ایک ایسی مہر ہے' جس سے اس خط کو مہر بند (seal) کر دیا گیا ہے۔

آج ہم ایک اور طرح کا رواج دیکھتے ہیں۔ جب مثلاً کسی کاپی کے ایک صفحے کو مکمل کر چکتے ہیں' تو اسکے نیچے ایک خاص انداز کی لائن کھینچ کر دستخط کر دیتے ہیں' تاکہ اسکے بعد کوئی دوسرا وہاں کوئی چیز نہ لکھ سکے اور اس میں کسی چیز کا اضافہ نہ کر سکے۔

جب مہر لگائی جاتی تھی' تو اسکی دو خاصیتیں ہوتی تھیں' ایک یہ کہ وہ خط لکھنے والے کا مکمل تعارف کرا دیتی تھی' اور دوسری یہ کہ اب خط اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے اور اسکے نیچے اختتام کی علامت لگی ہوئی ہے۔ یہاں خاتم الانبیا کے سلسلے میں جو تعبیر استعمال کی گئی ہے' وہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ یہ وہ نقش ہے جس کے ساتھ ہی مکتوبِ نبوت' کتابِ نبوت' درسِ نبوت اپنے اختتام کو پہنچتا ہے' اور یہ اسکے اختتام کی علامت ہے۔ گویا اسکے بعد آکر کوئی کسی بھی نام سے (نبوت کا) دعویٰ کرے گا' تو وہ دعویٰ جعلی اور جھوٹا ہوگا۔ اس لفظ کو چاہے ہم خاتَم پڑھیں یا خاتِم پیغمبر اکرمؐ کے آخری

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) حمزہ بن حبیب زیات کوفی' ابوالحسن کسائی کوفی' ابوعمرو بن علاء بصری اور ابن عامر دمشقی۔ (مترجم)

پیغمبر ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ خاتم الانبیاؐ کی ختمِ نبوت پر دلالت کرنے والی آیاتِ قرآنی میں سے ایک آیت ہے۔

ہمارے پاس قرآنِ کریم میں ختمِ نبوت کے بارے میں اور بھی آیات ہیں۔ایسی آیات ہیں جن کی عبارت یہ نہیں ہے' لیکن اُن کا مفہوم اسی معنی کو بیان کرتا ہے۔مثلاً وہ آیات جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس پیغمبر (خاتم الانبیاؐ) کی امت' امتِ وسط ہے' امتِ معتدل ہے' افضل ترین امت ہے: وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّ سَطًا.... (۱) امتِ کامل اور معتدل' ایک ایسی امت جس سے اعلیٰ امت دنیا میں ہو ہی نہیں سکتی۔خود یہ بات ختمِ نبوت پر دلالت کرتی ہے۔اگر ہمارے پیغمبرؐ کے بعد کوئی پیغمبر آئے' تو وہ پیغمبر اور وہ امت اس امت اور اس پیغمبرؐ سے ناقص تر نہیں ہوسکتی۔اگر بعد میں کوئی امت آئے' تو اسے کامل تر ہونا چاہیے۔جبکہ قرآن کہتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر تربیت شدہ اس امتِ اسلامیہ کے بعد اس سے اعلیٰ اور افضل کوئی امت نہیں آئے گی۔

اسی طرح وہ آیات جو خود قرآنِ مجید کے بارے میں ہیں' جن میں فرمایا گیا ہے کہ: ہم ہمیشہ کے لیے اس کتاب کے محافظ اور نگہبان ہیں: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. (۲) ہم نے اس ذکر اور اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی ہمیشہ کے لیے اسکے محافظ اور نگہبان ہیں۔

''ہم اسکے محافظ اور نگہبان ہیں'' سے کیا مراد ہے؟

کیا مراد یہ ہے کہ مثلاً ہم ''لائبریریوں میں اسکی حفاظت کرتے ہیں؟ اسکے نسخے کی حفاظت کرتے ہیں؟ یا لوگوں کے درمیان اسکی اصل حالت میں اسکی حفاظت کرتے ہیں' اس کو زندہ رکھتے ہیں۔یقینی طور پر یہ آخری بات مراد ہے' یعنی قرآنِ مجید ہمیشہ لوگوں کے درمیان موجود رہے گا' لہٰذا یہ منسوخ ہوسکنے والی کتاب نہیں ہے۔

۱۔سورۂ بقرہ ۲۔آیت ۱۴۳

۲۔سورۂ حجر ۱۵۔آیت ۹

قرآنِ مجید میں ایسی آیات بھی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تمام انبیائے سابقین نے ہمارے نبیؐ کی بشارت دی تھی اور سب آنحضرتؐ کے لیے میدان ہموار کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آیت ہے: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ. (۱) ہم نے بلا استثنا تمام انبیا سے عہد لیا ہے کہ ہم تمہارے دور میں تمہیں کتاب و حکمت عطا کر رہے ہیں، لیکن بعد میں (یعنی آئندہ زمانے میں) ایک نبی آئے گا جو گزشتہ انبیا کی تصدیق کرے گا، تم پر لازم ہے کہ تم ابھی سے اس پیغمبرؐ پر ایمان لے آؤ اور تم پر لازم ہے کہ تم اسکی مدد کرو اس طرح کہ اپنی امتوں کو اسکی بشارت دو اپنی امت کو اس پر ایمان لانے کی تلقین کرو: قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ. کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ. اس بات پر مجھ سے عہد کیا ہے (یعنی کیا تم اس بات پر مجھ سے پیمان باندھنے پر تیار ہو؟) قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا. انہوں نے کہا: ہاں ہم عہد کرتے ہیں۔

پھر خداوندِ عالم نے فرمایا: قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ. تم سب گواہ رہنا، اور میں خود بھی ایک شاہد اور گواہ ہوں۔ یہ آیتِ کریمہ نحوی اور قواعد کی ترکیب کے لحاظ سے (جیسا کہ صاحب ''مجمع البیان'' کہتے ہیں) قرآن کی مشکل ترین آیات میں سے ہے۔ عربی زبان کے قواعد کے اعتبار سے لفظ ''لما'' میں مثلاً اس کا ما موصولہ ہے یا زمانیہ ہے، یا پھر مصدریہ ہے۔ ہم اسے لَمَا پڑھیں، یا لِما، یا لَمَا؟ ایک آدمی نے اسے لِما پڑھا ہے۔ بہرحال اس آیت کا مجموعی منظور و مقصود یہی ہے، اور یہ وہی مضمون ہے جو ہماری روایات میں بھی کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ ان ہی {روایات} میں سے نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا نے تمام انبیا سے اس نبی کے لیے عہد لیا ہے۔: یعنی گزشتہ نبوتیں اور شرائع اس آخری شریعت کا مقدمہ اور تمہید تھیں، تمام نبوتیں اس نبوت کے لیے مقدمہ تھیں اور یہ نبوت تمام نبوتوں کا ذی المقدمہ (۲) ہے۔

۱۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۸۱

۲۔ یعنی وہ چیز جس کے لیے ایک مقدمے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہر آنے والے نبی نے جس طرح لوگوں کو خدا اور قیامت کی دعوت دی ہے اور لوگوں کے اندر خدا اور قیامت پر ایمان پیدا کیا ہے اسی طرح اسکی یہ بھی ذمے دار تھی کہ وہ لوگوں میں خاتم الانبیا کی نبوت پر ایمان کو بھی پیدا کرے، جو مستقبل سے تعلق رکھنے والی ایک بات ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج ہم جن چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں ان میں حضرت حجت ابن الحسنؑ کے ظہور پر ایمان بھی شامل ہے۔ مستقبل میں امامؑ کے ظہور پر ایمان قیامت پر ایمان اور رسول اللہ کی نبوت پر ایمان کے علاوہ ہے۔ اس وقت ہم پر لازم ہے کہ ایک ایسی بات پر ایمان رکھیں جسے مستقبل میں واقع ہونا ہے۔ تمام انبیا نے خاتم الانبیا کے ظہور کی بشارت دی ہے۔ خصوصاً حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں قرآن مجید نقل کرتا ہے: وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ. (۱) حضرت عیسیٰ ابن مریم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں اللہ کی طرف سے تمہارے لیے رسول ہوں، اور گزشتہ کتاب توریت کی تائید اور تصدیق کرتا ہوں۔ میں موسیٰ کی نبوت اور اُن کی کتاب کی تصدیق کرتا ہوں، اور میں مستقبل میں آنے والے ایک نبی کی نوید اور بشارت دینے والا ہوں، جس کا نام احمد ہے۔

حضرت علیؑ کا کلام

امیر المومنینؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: تمام انبیا کے درمیان ایک اتصال پایا جاتا تھا، اور وہ یہ کہ گزشتہ انبیا لازماً آنے والے انبیا کی بشارت دیا کرتے تھے، بالخصوص خاتم الانبیا کی۔ آنے والا نبی گزشتہ انبیا کی جانب سے کرائے گئے اپنے تعارف سے استفادہ کیا کرتا تھا اور وہ سب اس بات کے پابند تھے کہ لوگوں کو آنحضرتؐ پر ایمان لانے کی دعوت دیں۔

آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا ایک اصول یہ ہے کہ وہ ہم سے کہتا ہے کہ تمہیں سابقہ کتب اور انبیا پر ایمان لانا چاہیے، نبوت عامہ پر ایمان رکھنا چاہیے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

۱۔ سورۂ صف ۶۱۔ آیت ۶

وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ۔ (۱) بنیادی طور پر یہ ایک تسلسل تھا' گزشتہ انبیا نے لوگوں کے اندر آئندہ آنے والے انبیا اور بالخصوص آخری نبوت پر ایمان ایجاد کیا' اور بعد میں آنے والے انبیا گزشتہ انبیا کی نبوت کی تصدیق اور تائید کیا کرتے تھے۔ (اس بارے میں) نہج البلاغہ میں آنے والی عبارت یہ ہے:

"وَ لَمْ یُخْلِ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ خَلْقَہٗ مِنْ نَبِیٍّ مُرْسَلٍ 'اَوْ کِتَابٍ مُنْزَلٍ' اَوْ حُجَّۃٍ لَازِمَۃٍ' اَوْ مَحَجَّۃٍ قَائِمَۃٍ. رُسُلٌ لَا تُقَصِّرُ بِھِمْ قِلَّۃُ عَدَدِھِمْ' وَلَا کَثْرَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ لَھُمْ مِنْ سَابِقٍ سُمِّیَ لَہٗ مَنْ بَعْدَہٗ 'اَوْ غَابِرٍ عَرَّفَہٗ مَنْ قَبْلَہٗ. عَلٰی ذٰلِکَ نَسَلَتِ الْقُرُوْنُ' وَمَضَتِ الدُّھُوْرُ' وَسَلَفَتِ الْآبَاءُ' وَخَلَفَتِ الْاَبْنَاءُ....." (۲)

فرماتے ہیں خداوند تبارک وتعالیٰ نے کبھی اپنی مخلوقات' زمین اور بشر کو محروم نہیں رکھا ہے۔ یا تو ان کے درمیان ایک نبیٔ مرسل موجود رہا ہے' یا ان کے درمیان تحریف سے محفوظ ایک آسمانی کتاب موجود رہی ہے (یہ ابن میثم کے بقول مانعۃ الخلوّ ہے' مانعۃ الجمع نہیں) (۳) یا پھر ان کے درمیان ایک حجۃ لازمہ موجود رہی ہے' ایک ایسی حجت جو لوگوں پہ تمام ہوگئی ہو۔ یا پھر لوگوں کے سامنے ایک واضح راہ ہدایت موجود رہی ہے۔ ایسے پیغمبر رہے ہیں جن کے پاس افراد کی کمی ان کی جانب سے کسی کوتاہی کا سبب نہیں بنی۔ یعنی ان کی تعداد ہمیشہ اُن لوگوں سے کم رہی ہے جن کے لیے انہیں بھیجا گیا تھا۔ لیکن اس کمی کے باوجود وہ اپنے فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ انہوں نے تمام تر سختیوں' مصائب اور صعوبتوں کے باوجود اپنا فریضہ

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت۔ ۲۸۵

۲۔ نہج البلاغہ۔ خطبا

۳۔ مانعۃ الخلو اور مانعۃ الجمع منطق کی دو اصطلاحیں ہیں۔ مانع الخلو سے مراد یہ ہے کہ دو چیزیں ایک جگہ سے بہ یک وقت ختم نہ ہوسکیں البتہ اس جگہ ان دونوں کا بہ یک وقت ہونا ممکن ہے۔ مانعۃ الجمع سے مراد یہ ہے کہ دو چیزیں ایک جگہ اکٹھا نہ ہوسکیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ دونوں اس جگہ ہوں ہی نہیں۔ (مترجم)

انجام دیا ہے۔ انہیں جھٹلانے والوں اور ان کے دشمنوں کی کثرت اس بات کا سبب نہیں بنی کہ انہوں نے اپنے کام میں کوئی کسر چھوڑی ہو۔ ان میں سے بعض سابق اور متقدم تھے جن کے بعد آنے والوں کا ان سے تعارف کرایا جاتا رہا ہے۔ (مثلاً نوحؑ اور ابراہیمؑ سے کہا گیا تھا کہ تمہارے بعد موسیٰ اور عیسیٰ آئیں گے شریعت ختمیہ آئے گی) اور بعض متاخرین تھے جو اپنے سے پہلے آنے والوں کو پہچانتے تھے اور لوگوں کو ان سے متعارف کراتے تھے۔ اسی طرح ایک کے بعد دوسری نسل سامنے آتی رہی اور زمانہ گزرتا گیا: اِلٰی اَنْ بَعَثَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ مُحَمَّداً رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ . یہاں تک کہ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا: لِاِنْجَازِ عِدَتِهٖ وَاِتْمَامِ نُبُوَّتِهٖ. آنحضرت کو بھیجا تا کہ اُن کے ذریعے لوگوں سے کیا گیا وعدہ وفا کرے اور ان کے ساتھ سلسلۂ نبوت کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور اس کا اختتام کرے: مَا خُوذاً عَلَى النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقُهٗ. حالانکہ تمام انبیا سے اُن کے بارے میں عہد لیا جا چکا تھا (یہ آیت وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ .... (سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۸۱) کے مضمون کی جانب اشارہ ہے) خدا نے اُن کے لیے تمام انبیا سے عہد لیا تھا کہ وہ ان پہ ایمان رکھیں گے اور اُن کی آمد کی بشارت دیں گے اور اپنی امتوں کو ان سے متعارف بھی کروائیں گے۔ اپنی کتابوں اور آثار احادیث اور سنتوں میں اُن کے وجود کی خوشخبری دیں گے۔

مَشْهُوْرَةً سِمَاتُهٗ. انہیں ان حالات میں مبعوث کیا جب امتوں کے درمیان اُن کی علامات مشہور و معروف تھیں۔ یعنی کیونکہ خدا نے انبیا سے یہ عہد لیا ہوا تھا کہ وہ اُن کی علامات اور خصوصیات سے لوگوں کو آگاہ کریں گے اور لوگوں کے لیے انہیں ضبطِ تحریر میں لائیں گے اور یوں کیونکہ آسمانی کتب اور انبیائے ماسلف کے چھوڑے ہوئے آثار میں اس پیغمبر کی تمام علامات اور نشانیاں ذکر ہو چکی تھیں، مثلاً یہ بات مشہور تھی کہ یہ پیغمبر جزیرۃ العرب سے اٹھے گا (یہ ایک معروف و مشہور بات تھی) جس ماحول میں وہ زندگی بسر کرے گا اسکے مطابق اسکی سواری اونٹ ہوگی (یہ ایک مشہور علامت تھی) اسکے کاندھوں کی پشت پر ایک نشان ہوگا (یہ آپ کی ایک مشہور علامت تھی) آنحضرتؐ کا اسم مبارک اور آپ کے والد گرامی اور خاندان کی خصوصیات سب

مشہور و معروف علامات تھیں۔ اسکے علاوہ آپ کا ''اُمّی'' ہونا یعنی کسی سے کسبِ علم نہ کرنا' کسی مدرسے نہ جانا' کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کرنا بھی ایک مشہور علامت تھی۔ انبیائے ماسلف نے اپنی امتوں کو ان علامات سے آگاہ کیا تھا۔

ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے: اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ. وہ لوگ جو ایک رسول اور نبی کی پیروی کرتے ہیں (رسول اور نبی میں کیا فرق ہے؟ اسے بعد میں بیان کریں گے) نبیٔ اُمّی' یعنی جس نے پڑھا لکھا نہ ہو' جس نے کتاب' مدرسہ اور استاد نہ دیکھا ہو: اَلَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَ الْاِنْجِیْلِ. (۱) ''اُسکے اور اُسکی علامات کے بارے میں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں'' اُس زمانے میں پیغمبرؐ پر ایمان لانے والے بہت سے افراد وہ تھے جنہوں نے مذکورہ علامات کی بنیاد پر اس زمانے میں ایک پیغمبر کے ظہور کا اندازہ لگایا ہوا تھا' اور اس بارے میں دوسروں کو بھی بتایا تھا۔

اسلام کے خاص کر مدینہ میں اس طرح پھیل جانے اور لوگوں کے اذہان کے نبی کریم کو قبول کرنے (باوجود یہ کہ ان کی اجتماعی و سیاسی صورتحال سازگار نہ تھی اور وہ اپنی حکمرانی کے لیے عبداللہ ابن اُبی کا چناؤ کرنا چاہتے تھے) کی اہم وجہ یہ تھی کہ مدینہ یہودی آبادی کا مرکز تھا' اور علمائے یہود مسلسل یہودیوں اور دوسرے افراد سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں آسمانی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ اس سرزمین پر ایک پیغمبر مبعوث ہوگا' اور ساتھ ہی اس پیغمبر کی علامات اور نشانیاں بھی لوگوں کو بتاتے تھے۔ اگرچہ جب پیغمبر اسلامؐ مبعوث ہوئے تو ان میں سے بعض لوگ آنحضرتؐ پر ایمان نہ لائے اور بعض انہی علامات کی بنیاد پر نبی کریمؐ پر ایمان لے آئے۔ ان ایمان لانے والوں میں سے ایک عبداللہ بن سلام تھے۔

غرض یہی وجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا یہاں بیان کیا جانے والا یہ قول' جس میں آپ فرماتے ہیں کہ: لِاِنْجَازِ عِدَتِهٖ وَاِتْمَامِ نُبُوَّتِهٖ' مَاْخُوْذًا عَلَى النَّبِیِّیْنَ مِیْثَاقُهٗ'

۱۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۵۷

مَشْهُورَةً سِمَاتُهُ كَرِيماً مِيلادُهُ. (۱) اس سے قطع نظر کہ باقاعدہ وضاحت کرتا ہے کہ آنحضرتؐ پر نبوت کی انتہا اور اختتام ہوا' اس دوسرے نکتے کی بھی تصریح کرتا ہے کہ تمام انبیا پر فریضہ عائد کیا گیا تھا کہ وہ لوگوں کو خاتم الانبیا کی رسالت کی بشارت دیں اور انہیں اُن کے بارے میں آگاہ کریں۔

ہمیں آنحضرتؐ کے خاتم الانبیا ہونے کے بارے میں شواہد اور دلائل پیش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ ہم نے یہاں عرض کیا' وہ صرف اس لیے ہے تاکہ اجمالاً لوگ جان لیں کہ اسلامی نصوص میں بھی ان مسائل کے بارے میں بہت کچھ آیا ہے' اور یہ صرف انگلیوں پر گنے جانے جتنا نہیں ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ یہ ضروریاتِ دین میں سے ہے' تو یہ ضروریاتِ دین میں سے ہونا صرف اس عنوان سے نہیں ہے کہ یہ ایک واضح نکتہ ہے۔

امیر المومنینؑ نے اپنے کلمات میں خاتم الانبیا کے وجودِ مقدس پر صلوات بھی بھیجی ہے' اسکے الفاظ ہیں: اجْعَلْ شَرَائِفَ صَلَوَاتِكَ وَنَوَامِيَ بَرَكَاتِكَ عَلَى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُولِكَ. اے اللہ اپنی پاکیزہ ترین رحمتیں اور مسلسل بڑھنے والی برکات اپنے بندے اور پیغمبر محمد پر نازل فرما' الْخَاتِمِ لِمَا سَبَقَ. جو سابقہ نبوتوں کے خاتم' وَالْفَاتِحِ لِمَا انْغَلَقَ' اور ان تمام دروازوں کو کھولنے والے ہیں جو آج تک بند پڑے تھے' وَالْمُعْلِنِ الْحَقَّ بِالْحَقِّ. (۲) اور حق کے ذریعے حق کا اعلان کرنے والے تھے۔

اس موضوع پر ابھی کافی گفتگو کی ضرورت ہے' جسے ہم انشاء اللہ آئندہ ہفتے عرض کریں گے۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ا (یہاں تک کہ مالک نے اپنا وعدہ پورا کرنے اور اپنا سلسلۂ نبوت مکمل کرنے کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج دیا' جن کے بارے میں انبیا سے عہد لیا جا چکا تھا اور جن کی علامات مشہور اور ولادت مسعود و مبارک تھی)

۲۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۷۲

دوسرا خطاب

علم اور عقل تبلیغی نبوت کے جانشین

دوسرا خطاب

علم اور عقل تبلیغی نبوت کے جانشین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.... اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

" مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ "

اگرچہ ہمارے پیش نظر یہ بات نہیں تھی کہ ہم ختم نبوت کے موضوع کے بارے میں قرآن کی آیاتِ کریمہ کی روشنی میں کوئی گفتگو کریں گے۔ یعنی ہمارے پیش نظر یہ نہ تھا کہ اُن آیاتِ قرآنی پر بہت زیادہ گفتگو کی جائے جن میں ختم نبوت پر کوئی اشارہ یا تصریح پائی جاتی ہے۔ ہم زیادہ تر اس موضوع کے دوسرے پہلوؤں پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں' لیکن کیونکہ ہم نے گزشتہ ہفتے لفظ "خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" کے بارے میں ایک مختصر گفتگو کی تھی' لہٰذا آج اس گفتگو کا بقیہ حصہ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

صدرِ اسلام سے لے کر گزشتہ صدی تک' ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس آیۂ کریمہ یا اس لفظ کے بارے میں کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار ہوتا' لیکن اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ بعض نفس پرست اور بدعتیں ایجاد کرنے والے لوگوں نے' جو عام طور پر آسمانی کتب کو گمراہی پھیلانے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں' اور ان میں کسی قسم کے دخل اور تصرف سے نہیں ہچکچاتے' انہوں نے اس حوالے سے کچھ باتیں کہی ہیں۔ لہٰذا ہم اس لفظ کے بارے میں ایک

مختصر سی گفتگو کر رہے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ ہفتے عرض کیا تھا کہ "خاتم" کے معنی ہیں "مایختم بہ" یعنی ایسی چیز جس کے ذریعے اختتام کیا جاتا ہے۔ عربی لغت میں "خاتم" اور "طابع" کے ایک ہی معنی ہیں۔ قرآن کریم میں جتنے بھی مقامات پر اس لفظ کا مادہ استعمال ہوا ہے وہاں اس کا یہی مفہوم ہے۔ نہ صرف لفظ خاتم کا مفہوم یہی ہے بلکہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی ختم کا مادہ آیا ہے وہاں اس سے مہر لگانے ہی کا مفہوم لیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کفار کے بارے میں فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰٓی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ۔ (۱) ایسے لوگ جو کفر، عناد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ آپ چاہے انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ خداوند عالم نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔

سورۂ مبارکہ "یٰسین" میں روز قیامت لوگوں کی حالت بیان کی گئی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے اعضاء و جوارح ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ وہاں زبان سے اقرار کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ خود اعضاء و جوارح بولیں گے۔ مثلاً انسان کا ہاتھ جن جن گناہوں کا مرتکب ہوا ہوگا انہیں بیان کرے گا، درحقیقت یہ گناہ اس ہاتھ میں ریکارڈ ہو چکا ہے۔ انسان کا پیر جس گناہ کا مرتکب ہوا ہوگا اسے بیان کرے گا، یہ گناہ ایک شکل میں اسکے پیر میں ثبت ہو چکا ہے۔ انسان کے بدن کی کھال (روایت میں ہے کہ یہ انسان کے اعضائے تناسل کی جانب کنایہ ہے) جس جس گناہ کی مرتکب ہوئی ہے وہ اس میں محفوظ ہے۔ یہی معاملہ انسان کی آنکھ اور اسکے کانوں کا ہے۔ اور کیونکہ وہ دنیا حیات اور زندگی کی دنیا ہے لہٰذا وہاں تمام اعضا زندہ محشور ہوں گے اور جن اعمال کے وہ مرتکب ہوئے ہیں، خود ان کی گواہی دیں گے۔ اسے ایک ٹیپ ریکارڈر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ ریکارڈنگ کے وقت انسان کو محسوس نہیں ہوتا اسے وہاں صرف ایک کیسٹ دکھائی دیتی ہے۔ انسان بول رہا ہوتا ہے اور وہ کیسٹ گھوم رہی ہوتی ہے۔ لیکن اسے

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۶، ۷

معلوم نہیں ہوتا کہ جب اس کیسٹ کو ریوائنڈ کیا جائے گا اور ایک دوسرے انداز سے اسے ریکارڈ پلیئر میں لگایا جائے گا' تو کیا ہوگا۔ اس وقت یہ ساکت و جامد کیسٹ ایک بولنے والی چیز بن جائے گی۔ وہاں آیت میں یوں ہے کہ: اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ. (۱)۔ ہم اس دن (روزِ قیامت) ان کے منہ پر مہریں لگا دیں گے (نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ کے اسکے سوا کوئی اور معنی نہیں ہیں) ہم یہ منہ بند کر دینگے' تاکہ وہ بول نہ سکے' ہم کہیں گے کہ اب تجھے بولنے کی اجازت نہیں ہے' اب تمہارے یہ اقرار یا انکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ میں نے اپنے ہاتھ سے فلاں گناہ کیا تھا یا نہیں کیا تھا' اپنے پیر سے فلاں گناہ کیا تھا یا نہیں کیا تھا' اپنی آنکھ سے فلاں گناہ کیا تھا یا نہیں کیا تھا: وَ تُكَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ. اُن کے ہاتھ ہم سے کلام کرینگے. وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ. اور ان کے پیر جن اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں خود ان کی گواہی دیں گے۔

مولانا روم اپنے ایک معروف شعر میں کہتے ہیں:

هر كه را اسرار حق آموختند مهر كردند و دهانش دوختند

مہر لگانا ہمیشہ سے کسی خط کے خاتمے یا اسکے بند کیے جانے کی علامت رہا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ قدیم زمانے میں لفافے (envelopes) کس طرح بند کیے جاتے تھے' البتہ اتنا جانتا ہوں کہ جب خط لکھنے کے بعد اسے بند کرتے تو ایک مادہ (اب وہ مادہ کیا ہوتا تھا مجھے معلوم نہیں آج کی طرح کی لاکھ (۲) یا مہر نہیں ہوتی تھی' لیکن لاکھ کی طرح کا ہوتا تھا) اس کاغذ پر چپکا کر اس پر مہر لگا دیتے تھے' جو اس بات کی علامت ہوتا تھا کہ اب اسے بند رکھا جائے۔ ''ختم کر دینے'' کا مفہوم ایک ثانوی مفہوم ہے جو مہر لگانے کے اس مفہوم سے پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ مہر لگا دینا' خاتمہ کر دینے کا لازمہ ہے' اور یوں رفتہ رفتہ جس کام کو بھی ختم کرنا چاہتے' چاہے اس میں مہر لگانا نہ بھی ہوتا ہو' وہاں لفظ ''ختم'' استعمال کیا جانے لگا۔

۱۔ سورۂ یٰسین ۳۶۔ آیت ۶۵

۲۔ ایک قسم کی گوند جو لاکھ کے کیڑے سے پیدا ہوتی ہے' جسے پگھلا کر مہر لگائی جاتی ہے۔ (مترجم)

زیارت جامعہ میں ہم پڑھتے ہیں: "بِکُمْ فَتَحَ اللّٰهُ وَبِکُمْ یَخْتِمُ" خدا نے آپ ہی کے ذریعے سے آغاز کیا اور آپ ہی کے ذریعے سے اختتام کرے گا۔ انگوٹھی کو بھی خاتم کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ انگوٹھی دو کام کرتی تھی' یعنی {ہاتھ کی زینت ہونے کے ساتھ ساتھ} مہر بھی ہوتی تھی۔ اخبار و احادیث کی اصطلاح میں جب ہم پیغمبر اکرمؐ یا حضرت علیؑ یا کسی امامؑ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں' تو کہتے ہیں کہ آپ کی خاتم فلاں چیز تھی۔ یعنی آپ کی مہر یہ تھی۔ اور یہ مہر لازماً آپ کی انگوٹھی ہوا کرتی تھی' یعنی آپ کی انگوٹھی مہر بھی ہوا کرتی تھی۔ پس "خاتم النبیین" یعنی وہ ہستی جس پر سلسلۂ نبوت ختم اور بند ہو گیا' تمام ہوا' مہر لگ گئی اور اسکے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' اس بارے میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں۔

یہاں ایک اور نکتہ ہے' جس کے بارے میں وضاحت ہم ضروری سمجھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہم اس بارے میں بدعت گزار لوگوں کی فضول باتوں کے جواب بھی دیں گے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ: ہماری گفتگو میں زیادہ تر یہ بات پیش نظر ہے کہ شریعتوں کا اختتام کیوں ہوا ہے؟ ہماری گفتگو اس سوال کے گرد تھی کہ اگر خدا کا دین اور اسکی شریعت' یعنی اسکی طرف سے نازل ہونے والا قانون ایک ہی ہے' تو پھر اوّل سے آخری نبی تک صرف ایک ہی شریعت ہونی چاہیے تھی۔ آخر متعدد شریعتیں کیوں نازل کی گئی ہیں: شریعت نوحؑ' ابراہیمؑ' موسیٰؑ' عیسیٰؑ اور اسلام کیوں ہیں؟

اگر آسمانی شریعتوں اور قوانین الٰہی میں ناسخ اور منسوخ پائے جاتے ہیں' اور ان میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں' تو یہ تبدیلیاں زمانے کے تقاضوں کے تحت ہوتی ہیں' ان کی کوئی اور وجہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ زمانہ اور انسانی زندگی کے حالات مسلسل تغیر پذیر ہیں' لہٰذا انسانی زندگی کے معاشرتی' اقتصادی' سیاسی' علمی اور ثقافتی حالات میں بھی تغیرات جنم لیتے رہتے ہیں' اور اس کی وجہ سے خداوند عالم انسان کے لیے بھیجے گئے قوانین کو بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر تغیرات کی وجہ یہ ہے' تو پھر شریعتوں کا خاتمہ کیوں کیا گیا ہے؟ کیونکہ زمانے کا سفر تو جاری رہے گا' اور انسانی زندگی کے معاشرتی' اقتصادی' ثقافتی اور سیاسی حالات مسلسل تغیر کا شکار ہیں۔ پس اس بنیاد پر کبھی بھی آخری شریعت کے عنوان سے دنیا میں کوئی شریعت نہیں ہونی چاہیے۔ ہم نے اپنی گفتگو میں اس پہلو کو

پیش نظر رکھا ہے۔

لیکن ایک اس سے چھوٹا سوال سامنے آتا ہے۔ پہلے ہمیں اس چھوٹے سوال کو پیش کرنا اور اس کا جواب دینا چاہیے' پھر اسکے بعد اس بڑے سوال کی طرف جائیں۔ وہ سوال یہ ہے کہ:
ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ: بہت خوب' (ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ) شریعتیں ختم ہو جاتی ہیں' آخری شریعت کے عنوان سے ایک قانون اور شریعت کو نازل ہونا چاہیے' اور اسکے بعد کوئی شریعت وجود میں نہ آئے' لیکن آخر نبوت کا اختتام کیوں ہو؟ تمام انبیا کا صاحبِ شریعت ہونا تو ضروری نہیں ہے' گنتی کے صرف چند انبیا صاحبِ شریعت وقانون ہیں' جنہیں قرآن نے اُولِی الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ کہا ہے۔ دنیا میں تشریف لانے والے اتنے بہت سے انبیا (ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار یا اس سے کم یا زیادہ جتنی بھی ہو) میں سے گنتی کے صرف چند ایک نبی صاحبِ شریعت تھے' باقی سب نبی تھے لیکن صاحبِ شریعت نہ تھے۔ وہ جس زمانے میں مبعوث ہوتے تھے' اس زمانے میں لوگوں کے درمیان رائج شریعت اور قانون کے مبلغ ہوتے تھے۔

پس نبی آخر الزماں' وہ نبی جس کی شریعت خاتم الشرائع اور جس کی کتاب خاتم الکتب اور آخری کتاب ہے' کیوں اسکے بعد کچھ چھوٹے انبیا مبعوث نہیں ہوتے' جن کا کام لوگوں کو شریعتِ اسلام کی جانب دعوت دینا ہو؟ وہ نبی ہوں لیکن اُن کا کام دین اسلام کی ترویج ہو' اسی طرح جیسے حضرت ابراہیمؑ کے بعد سینکڑوں نبی آئے اور وہ سب کے سب حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کے مروج تھے۔ حضرت لوطؑ نبی تھے' لیکن حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کے مروّج تھے۔ حضرت شعیب' حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ نبی تھے' لیکن حضرت ابراہیمؑ کی شریعت کی جانب دعوت دیا کرتے تھے۔ ہارونؑ اور یوشعؑ نبی تھے' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی دعوت دیتے تھے۔ شریعتیں ختم ہو گئیں' نبوتیں کیوں ختم ہوں' اور قرآن نے وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کیوں کہا ہے؟ اس کا فلسفہ کیا ہے؟

اگر ہم اس سوال کا جواب اچھی طرح سمجھ جائیں' تو اُس بڑے سوال کا جواب بھی ہمارے سامنے واضح ہو جائے گا۔

{اس سلسلے میں} پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی کے معنی کیا ہیں؟

نبی یعنی پیغامبر' ایسی ہستی جو خدا کی طرف سے لوگوں کے لیے پیغام لے کر آتی ہے 'مُنبِیٔ عن اللہ۔ ''پیغمبر'' اُسے کہتے ہیں جس پر خدا کی جانب سے وحی ہوتی ہو' اب اس وحی کی کوئی بھی صورت ہو' یعنی خدا کی جانب سے اسے خواب' یا کسی بھی دوسرے ذریعے سے باتیں پہنچائی جاتی ہوں' اسکے باطن' روح اور قلب کے راستے اسے ہدایات دی جاتی ہوں کہ جاؤ اور لوگوں کی رہنمائی کرو۔ مثال کے طور پر عرض کریں کہ ابراہیمؑ کی شریعت یہ ہے' جاؤ اور لوگوں کو اسکی تعلیم دو' یا انہیں دینِ ابراہیم پر عمل کی ترغیب دو۔

ایسے انبیا کے وجود کی ضرورت اس بنا پر ہے کہ لوگوں کو شریعتِ ابراہیمی کی تعلیم دینے کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ کچھ افراد کو الہام کے ذریعے مبعوث کیا جائے۔ یعنی اگر ایک ایسا زمانہ ہوتا جس میں لوگ علم اور تمدن کے مالک ہوتے اور تمدن کی بنیادیں مضبوط ستونوں پر قائم ہوتیں' اور حضرت ابراہیمؑ کی کتاب مختلف طریقوں سے محفوظ ہوتی' کاغذ وغیرہ پر طبع شدہ صورت میں موجود ہوتی اور علما اور دانشوروں کا ایک طبقہ موجود ہوتا' جس میں اس بات کی قدرت ہوتی کہ لوگوں کو شریعتِ ابراہیمی کی جانب دعوت دے سکے' تو ایسے افراد کی ضرورت نہ رہتی جنہیں الہام کے ذریعے سے یہ ذمے داری تفویض کی جاتی۔

جبلّی ہدایت اور عقلی ہدایت کے درمیان معکوس رابطہ

ہمیشہ سے الہامی اور جبلّی (instinct) ہدایت اور عقلی اور عقلانی ہدایت کے درمیان ایک رابطہ موجود رہا ہے۔ ایک زندہ موجود علمی اور عقلی رشد و نمو کے اعتبار سے جس قدر کمزور اور ضعیف ہوتا ہے' خداوندِ عالم اسے اسی قدر طبیعی اور جبلّی الہامات کے ذریعے سے ہدایت فراہم کرتا ہے۔ اور اس {اوّل الذکر} پہلو سے جس قدر اس میں طاقت اور قدرت پیدا ہوتی جاتی ہے' اتنا ہی وہ اس {ثانی الذکر} اعتبار سے ضعیف و ناتواں ہوتا چلا جاتا ہے' کیونکہ اسکی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ حیوانات ہی کو لے لیجیے' جو حیوان جس قدر کم تر ہے' یعنی جس قدر اس کا حسی' وہمی اور خیالی شعور کم ہے' (چہ جائیکہ فکری)' اسی قدر اسے طبیعی طریقے سے زیادہ ہدایات ملتی ہیں۔ مثلاً

حشرات (insects) جو ایک کم تر درجے پر ہیں' دوسرے تمام حیوانوں کے مقابلے میں انہیں طبعی طریقے سے زیادہ ہدایات ملتی ہیں۔ ایک مکھی یا ایک چیونٹی یا ایک مکڑی یا شہد کی مکھی کو جو طبعی الہام حاصل ہوتے ہیں' وہ بڑے حیوانات جیسے ہاتھی' گھوڑے یا بندر کو حاصل نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ حیوانات رشد و نمو کے لحاظ سے اُن سے بہتر ہیں' اور اپنی حس' وہم' خیال اور ذہانت سے اپنی زندگی گزار سکتے ہیں' انہیں طبعی ہدایات کی ضرورت نہیں' ان میں طبعی طریقے سے ہدایات حاصل کرنے کی صلاحیت بہت ہی کم ہوتی ہے۔ انسان جو باقی حیوانات کی نسبت زیادہ ذہانت اور قوت کا مالک ہے' وہ جبلّت (instinct) اور جبلّی طور سے حاصل ہونے والی ہدایات کے اعتبار سے سب سے زیادہ کمزور ہے۔

گزشتہ ادوار سے تعلق رکھنے والے انبیا' ایسے ادوار میں تھے جب ابھی انسان کی عقل اور اسے حاصل علم اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ وہ شریعت کا مبلغ بن سکے' یعنی واقعاً آج سے کئی ہزار سال پہلے کے انسان میں اتنی قدرت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ اسکے چند افراد اکٹھے ہو کر سوچ بچار کریں اور خود کو درپیش مسائل پر اپنی شریعت میں غور و فکر کریں' تجزیہ و تحلیل کریں' اجتہاد کریں اور ان مسائل کے حل تلاش کریں۔ اس وقت کا انسان وحشی تھا' پست حیوانات سے قریب تھا' اور جس طرح یہ ضروری تھا کہ اسے اسکی شریعت کے بنیادی کلی قوانین کی تعلیم وحی کے ذریعے دی جائے' اسی طرح اسکی تبلیغاتی مشنری کو بھی وحی کے ذریعے چلایا جانا ضروری تھا۔ اُس زمانے میں عقل اور علم اس کام کی انجام دہی کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ جوں ہی انسان اس مقام اور مرتبے پر پہنچتا ہے جہاں وہ واقعاً عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ (۱) کا مصداق ہوا' اپنی تاریخ کو محفوظ کر سکے' اپنے اسلاف کی تاریخ کا وارث بن سکے' وہ آسمانی کتاب جو اسکے حوالے کی جائے اسکی حفاظت کر سکے' احادیث اور اپنے پیغمبر کے بتائے ہوئے جوامع الکلم (کم از کم ان کے اصولوں) کی حفاظت کر سکے' تاکہ بعد میں آنے والے ان کی اساس پر علم کی بنیاد رکھ سکیں' انہیں حفظ اور تحریر کر سکیں اور دین کے معاملات پر تفقہ کر سکیں' تو پھر اس شریعت کی تبلیغ کے لیے انبیا کی

۱۔ سورۂ علق ۹۶۔ آیت ۵'۴

ضرورت نہیں رہتی۔

اسلام کے زمانے میں انبیا کا نہ ہونا خود بشریت کے ارتقا کی ایک دلیل ہے۔ یعنی علم و عالم' فقیہ و متفقہ' حکیم و فیلسوف' اُن انبیا کے جانشین قرار پائے جن کا کام دوسروں کی شریعتوں کی تبلیغ و ترویج تھا۔

لہٰذا آپ دیکھتے ہیں کہ مختلف ادوار میں جتنے بھی انبیا کتب کے ہمراہ آئے' اُن کی کتب کا نام و نشان نہ رہا' انسان کیونکہ فکری طور پر بالغ نہ تھا اس لیے اپنی آسمانی کتاب کی حفاظت نہ کر سکا۔ بتایئے صحف ابراہیم کہاں ہے؟ توریت کہاں ہے؟ حقیقی انجیل کہاں ہے؟ جو کچھ حضرت نوح پر نازل ہوا وہ کہاں ہے؟ کہاں ہے اصلی اوستا اور زرتشت کی حقیقی تعلیمات؟

اُس وقت کے انسان کی حالت ایک طفل مکتب کی سی تھی۔ آپ مکتب کے بچوں کے لیے کتاب خریدتے ہیں' چھ مہینے بعد آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کتاب ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ہے' اور ہر ٹکڑا ایک علیحدہ کونے میں پڑا ہے۔ اسکے برخلاف ایک عمر رسیدہ آدمی' ایک تیس سالہ طالب علم کو آپ ''مکاسب'' یا ''کفایہ''(۱) کی کتاب دیتے ہیں' وہ اس کتاب کو بیس سال تک استعمال کرتا ہے' درس و مباحثے اور تدریس میں اس سے کام لیتا ہے' اور آپ بیس سال بعد بھی اس کتاب کو دیکھتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ ابھی تک صاف ستھری ہے۔

صرف خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کا زمانہ ایسا تھا جس میں انسان اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا کہ اپنے اسلاف کے دور کی میراث کو آنے والے ادوار کے لیے محفوظ کر سکے۔ اس نے اپنی آسمانی کتاب کی حفاظت کی۔ یہ قرآن وہی ہے جو پیغمبر پر نازل ہوا۔ ہر دور میں ایسے علما پیدا ہوئے جنہوں نے مختلف طریقوں سے اسکے ظاہر اور معنی کی حفاظت کے لیے کوششیں کیں۔ یہ بشریت کے ارتقا اور رشد و کمال کی ایک مثال ہے۔ کسی اور آسمانی کتاب کے لیے ایسا کام نہیں کیا گیا ہے۔

۱۔ ''مکاسب'' فقہ کی ایک نصابی کتاب ہے' جس کے مصنف شیخ انصاریؒ (متوفی: ۱۲۸۱ھ) ہیں' جبکہ ''کفایہ'' اصول فقہ کی نصابی کتاب ہے' جس کے مصنف اخوند ملا محمد کاظم خراسانیؒ (متوفی: ۱۳۲۹ھ) ہیں۔ (مترجم)

بلوغ یا ختمِ نبوت کی علامت

جب قرآن نازل ہوا تو جو اوّلین کام کیے گئے اُن میں یہ بھی شامل تھا کہ سوچ پیدا ہوئی کہ عربی زبان کے قواعد کے لیے ایک علم کی بنیاد رکھی جانی چاہیے' کیونکہ ہماری یہ آسمانی کتاب عربی زبان میں ہے' اور جو لوگ اس کتاب کی تلاوت کرنا چاہتے ہیں انہیں عربی زبان کے قواعد سے واقف ہونا چاہیے۔ اسلام کی پہلی ہی صدی میں عربی زبان کے قواعد کا علم وجود میں آیا' علمِ لغت کی بنیاد رکھی گئی' اور لغت میں کیسی کیسی نفیس کتب تحریر کی گئیں۔ معانی' بیان اور بدیع کا علم وضع کیا گیا۔ یہ سب اس لیے تھا کہ انسان اپنی آسمانی کتاب سے وابستہ رہنا اور اسکی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر یہ نکتہ دلچسپی کا حامل ہے کہ قرآن کی زبان کے احیا کے لیے کوششیں کرنے والے اور اس سلسلے میں قربانیاں دینے والے اکثر افراد غیر عرب تھے۔

یہ سب باتیں اسلام کے دورِ ختم نبوت میں انسانیت کی پختگی اور بلوغت کی مثالیں اور ختمِ نبوت کی علامات ہیں۔ کسی شریعت اور کسی آسمانی کتاب کے لیے انسانیت کی طرف سے ایسے اقدامات نہیں اٹھائے گئے تھے۔ اسی پہلی صدی میں علمِ تفسیر وجود میں آیا۔ اسی پہلی صدی میں علمِ حدیث وجود میں آیا۔ پیغمبر اسلامؐ نے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ: نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ مَقالَتی فَوَعاها. خدا اس بندے کو خوش و خرم رکھے' جو مجھ سے جو کچھ سنتا ہے اسے محفوظ کر لیتا ہے۔ وَبَلَّغَها مَنْ لَمْ يَسْمَعْها. اور ان لوگوں تک پہنچاتا ہے' جنہوں نے اسے نہیں سنا ہے۔ (پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ: اُكْتُبوا عَنّی. جو کچھ مجھ سے سنتے ہو' اسے لکھ لو) رُبَّ حامِلِ فِقْهٍ غَيْرِ فَقيهٍ وَرُبَّ حامِلِ فِقْهٍ اِلىٰ مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ. (۱) فرمایا: جو کچھ مجھ سے سنتے ہو' اُسے لکھ لو' اور بعد میں آنے والے لوگوں کو منتقل کرو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو شخص براہِ راست مجھ سے سنتا ہے وہ میری بات کے وہ معنی نہیں سمجھتا جو اُسے سمجھنے چاہئیں' اور وہ بعد میں {مجھ سے سنی ہوئی وہ بات} اُن لوگوں کے حوالے کرتا ہے جو میری بات کے معنی سمجھتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ میری بات کے معنی سمجھتا ہے' لیکن جب وہ اُسے بعد کے لوگوں سے نقل کرتا ہے' تو کیونکہ وہ اس

۱۔ اصول کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۰۳۔

سے زیادہ کامل، قابل اور عالم ہیں اس لیے اسکی نقل کی ہوئی بات کو بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ یہ کام کیا گیا اور یہ خود انسانیت کے آگے کی طرف بڑھنے کی ایک مثال ہے۔

حتیٰ اگر آپ علوم کا جائزہ لیں، تو وہاں بھی ایسا ہی ہے۔ یعنی انسانیت نے اس اختتامی دور میں صرف دین کے اعتبار سے اپنی ترقی اور کمال کا ثبوت نہیں دیا ہے، بلکہ علم اور فلسفے کے اعتبار سے بھی اسے ثابت کیا ہے۔ دنیا میں جو علم اور فلسفہ محفوظ اور باقی ہے، وہ زمانۂ اسلام سے باقی ہے۔

آج ایک تقسیم بندی کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ: زمانۂ تاریخ اور زمانۂ ماقبلِ تاریخ۔ زمانۂ ماقبلِ تاریخ سے مراد وہ زمانے ہیں جن میں {زندگی بسر کرنے والے} انسان کی کوئی یادگار موجود نہیں۔ نہ کوئی تحریر، نہ کوئی لکھا ہوا پتھر، کوئی بھی شئے نہیں۔ لیکن اگر زمانۂ تاریخ سے ہماری مراد وہ زمانہ ہو جس میں انسان نے مسلسل اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا ہے، تو یہ صرف اور صرف زمانۂ اسلام ہے۔ حتیٰ یونانیوں اور ہندیوں کے باقی ماندہ آثار کو بھی مسلمانوں نے ہی محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی ہے۔ ایرانیوں کے آثار میں سے بھی جو کچھ اُس وقت تک باقی تھا، اسے مسلمانوں نے ہی محفوظ کیا ہے۔ اسلام سے قبل کے فاتحین گزشتہ زمانے کی میراث (heritage) کو تباہ و برباد کر دیتے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے ان کی حفاظت کی۔ عیسائی پادریوں نے بہت مشہور کیا کہ مسلمانوں نے اسکندریہ کے کتابخانے کو جلا ڈالا، حتیٰ خود مسلمانوں نے بھی بغیر سوچے سمجھے ان کی اس بات کا اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا۔ خوش قسمتی سے دورِ حاضر کے محققین نے ثابت کیا ہے کہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ خود عیسائیوں نے پہلے ہی اسے آگ لگا دی تھی۔

اسلام اپنے سے پہلے دور کو زمانۂ جاہلیت کا نام دیتا ہے۔ اسلام سے پہلے کی یہ جاہلیت قرآن کی نظر میں صرف عربوں تک محدود نہ تھی، بلکہ غیر عربوں کی جاہلیت بھی جاہلیت ہے۔

جاہلیت کی ضد علم ہے۔ اور جب قرآنی وحی کا آغاز ہوا، تو اس صورت سے ہوا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ. (۱) یعنی اسلامی وحی اور تکمیلی وحی کا آغاز ''قرأت'' یعنی متون

۱۔ سورۂ علق ۹۶۔ آیات ۱ تا ۵

(text) کے پڑھنے (ہر قسم کے پڑھنے کو قرأت نہیں کہا جاتا' صرف متن کے پڑھنے کو قرأت کہتے ہیں)' علم' لکھنے اور قلم سے ہوا۔ یہ بات خود یہ بتاتی ہے کہ قرآن کا دور' پڑھنے لکھنے اور علم وعقل کا دور ہے۔ یعنی اب دورِ نبوت (وہ دور جس میں انسان ان لوگوں کے ذریعے گزشتہ شریعتوں کی تبلیغ کیا کرتا تھا جن پر دین کی تبلیغ کے لیے وحی اور الہام ہوا کرتا تھا) گزر گیا۔ اب علما انبیا کے جانشین قرار دیے گئے ہیں' علم ودانش تبلیغی نبوت کے جانشین بن گئے ہیں۔

ہم واضح کر دیں کہ علم ودانش کے تبلیغی نبوت کے جانشین بننے سے کیا مراد ہے؟

مراد یہ ہے کہ وہ انبیا جو صرف دوسری شریعتوں کے مبلغ تھے' اور جو فقط دوسری شریعتوں کی جانب لوگوں کو دعوت دیا کرتے تھے' اب انبیا کا کام علم ودانش کیا کرتے ہیں' علم اور علما انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ادوار جہالت اور تاریکی کے ادوار تھے' اُن میں اُس قسم کی نبوتوں کی ضرورت تھی۔ اب لکھنے پڑھنے' علم کی تعلیم وتدریس' اور علم کی تدوین کے اس دور میں تبلیغی اور دعوتی نبوتوں کی ضرورت نہیں ہے۔

الہام کا باب بند نہیں ہوا ہے

ممکن ہے یہاں آپ ایک اور سوال کریں' اور وہ یہ کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد الہام کا دروازہ یکسر بند ہو گیا ہے' یا {صرف} بابِ نبوت بند ہوا ہے؟

جواب یہ ہے کہ بابِ نبوت' یعنی بابِ پیغمبری بند ہوا ہے' لیکن کشف' شہود اور الہام کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ممکن ہے ایک انسان اپنی باطنی پاکیزگی' کمال اور معنویت کے اعتبار سے ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ بقول عرفا کے اُس پر مکاشفات ہونے لگیں اور الہامی علم کے ذریعے اُسکے سامنے کچھ حقائق پیش کیے جانے لگیں' لیکن وہ لوگوں کو دعوت دینے پر مامور نہیں ہے۔

حضرت امیر علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ اللّٰہَ سُبْحَانَہٗ وَ تَعَالٰی جَعَلَ الذِّکْرَ جِلَاءً لِلْقُلُوبِ تَسْمَعُ بِہٖ بَعْدَ الْوَقْرَۃِ وَتُبْصِرُ بِہٖ بَعْدَ الْعَشْوَۃِ وَتَنْقَادُ بِہٖ بَعْدَ الْمُعَانَدَۃِ۔"

"پروردگار نے اپنے ذکر کو دلوں کے لیے جلا قرار دیا ہے جس کی بنا پر وہ بہرے

پن کے بعد سننے لگتے ہیں اور اندھے پن کے بعد دیکھنے لگتے ہیں اور عناد اور ضد کے بعد مطیع و فرمانبردار ہو جاتے ہیں۔"

اسکے بعد فرماتے ہیں:

"وَمَابَرِحَ لِلّٰهِ(عَزَّتْ آلاؤهُ) فِی الْبُرْهَةِ بَعْدَالْبُرْهَةِ وَفِی أزْمَانِ الْفَتَرَاتِ عِبَادٌ نَاجَاهُمْ فِی فِكْرِهِمْ وَكَلَّمَهُمْ فِی ذَاتِ عُقُولِهِمْ."

"اور خدائے عزوجل (جس کی نعمتیں عظیم و جلیل ہیں) کے لیے ہر دور میں اور ہر عہدِ فترت میں ایسے بندے رہے ہیں جن سے اس نے ان کے افکار کے ذریعے رازدارانہ گفتگو کی ہے اور ان کی عقلوں کے وسیلے سے ان سے کلام کیا ہے۔"(۱)

یعنی "ہمیشہ دنیا میں ایسے افراد رہے ہیں جن کے باطن اور ضمیر سے خدا ہم کلام رہتا ہے۔"

حضرت زہرا علیہا السلام ایسے ہی لوگوں میں سے تھیں، باوجود یہ کہ آپ نبی نہیں تھیں۔ قرآنِ مجید کی نص کے مطابق حضرت مریمؑ بھی ایسی ہی تھیں۔ حضرت امیرؑ ائمہؑ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هَجَمَ بِهِمُ الْعِلْمُ عَلٰی حَقِيقَةِ الْبَصِيرَةِ وَبَاشَرُوا رُوحَ الْيَقِينِ وَاسْتَلانُوا مَا اسْتَوْعَرَهُ الْمُتْرَفُونَ وَأنِسُوا بِمَا اسْتَوْحَشَ مِنْهُ الْجَاهِلُونَ."

"انہیں علم نے بصیرت کی حقیقت تک پہنچا دیا ہے، اور یہ یقین کی روح کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔ انہوں نے ان چیزوں کو آسان بنا لیا ہے جنہیں راحت پسندوں نے مشکل بنا رکھا تھا اور ان چیزوں سے اُنس حاصل کیا ہے جن سے جاہل وحشت زدہ تھے۔"(۲)

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۲۲

۲۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۱۴۷

خلاصۂ کلام یہ کہ ایک مرتبہ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسولِ کریمؐ کے بعد کوئی شخص صعود اور قوسِ صعودی کے اعتبار سے اصطلاحاً سیر الی الحق تک نہیں پہنچ سکتا' ایک ایسا مقام {نہیں پا سکتا} جہاں اس پر ایک طرح کے الہام ہونے لگیں۔ اور ایک مرتبہ ہم یہ کہتے ہیں کہ رسولِ کریمؐ کے بعد کیا کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو پیغمبر ہو جائے؟ یعنی وحی کے ذریعے اسے شریعت لانے یا کسی شریعت کی تبلیغ پر مامور کیا جائے؟ نہیں' ایسا کوئی شخص نہیں آئے گا۔

پہلی قسم کے شخص کو اخبار اور احادیث کی اصطلاح میں بعض اوقات ''محدّث'' کہا گیا ہے۔ ''محدّث'' یعنی ایسا شخص جس میں ایک حالت یا ایک معنویت پائی جائے جس کی بنا پر اُسکے قلب پر کچھ الہام کیے جا سکیں۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: اِنَّا لَا نَعُدُّ الْفَقِیہَ مِنْکُمْ فَقِیہاً حَتّٰی یَکُونَ مُحَدَّثاً۔ ہم تمہارے فقہا (اپنے اصحاب سے فرما رہے ہیں) میں سے کسی فقیہ کو فقیہ شمار نہیں کرتے' ماسوا اُسکے جو محدّث ہو۔ راوی تعجب کا اظہار کرتا ہے' کہ کیا کسی کا محدّث ہونا ممکن ہے؟ حضرت فرماتے ہیں: یَکُونُ مُفَهَّماً وَالْمُفَهَّمُ مُحَدَّثٌ۔ (۱) اللہ اسکے لیے حقائق کی تفہیم کرتا ہے' اور جب اسکے سامنے حقائق کی تفہیم ہو جاتی ہے' تو وہ محدّث ہو جاتا ہے۔ امامؑ یہ نہیں فرماتے کہ جبرئیل ظاہر ہو کر اس سے گفتگو کرتے ہیں' بلکہ فرماتے ہیں کہ خداوندِ عالم اسے شرح صدر عطا فرماتا ہے' جس کی بنا پر وہ چیزوں کو زیادہ بصیرت کے ساتھ سمجھنے لگتا ہے' اور ایسا شخص محدّث ہے۔

اس مقام پر ایک نکتہ یہ ہے کہ آخری شریعت کے بعد نبوت کا بطورِ کلی خاتمہ کیوں ہو گیا؟ اس کا جواب وہی ہے جو ہم نے عرض کیا' اس کا تعلق علم و دانش کے ظہور سے ہے' اور آج کی اصطلاح میں تمدن کے ظہور سے ہے جو اپنے لیے الٰہی تعلیمات کی حفاظت کر سکتا ہے' ان کے بارے میں تحقیق اور مطالعہ کر سکتا ہے' تفسیر لکھ سکتا ہے۔

قرآنِ کریم کے ظہور کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور ان تمام چودہ صدیوں میں ہمیشہ ایسے افراد رہے ہیں جن کا کام اس کتابِ مقدس پر تحقیق تھا۔ کوئی قرآنِ کریم پر لکھی جانے والی تفاسیر کی

۱۔ رجال کشی۔ ح ۲۔ منکم کی بجائے منهم (من الشیعة) آیا ہے۔

تعداد شمار نہیں کرسکتا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ہمارے اس زمانے اور عصرِ حاضر میں کتنے لوگ تفسیر لکھنے میں مشغول ہیں۔ یہ لوگ وہی کام کر رہے ہیں جو انبیائے ماسلف دوسری شریعتوں کی تبلیغ کے سلسلے میں کیا کرتے تھے۔

یہاں پر بعض اہلِ بدعت کی طرف سے پیدا کیے جانے والے ایک شبہ کا جواب واضح ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایک فضول بات جو کیا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ کہتے ہیں: قرآن نے "خاتم النبیین" کہا ہے "خاتم الرّسل" نہیں کہا۔ خاتم الانبیا ہے خاتم رسل نہیں' اس پیغمبر کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' لیکن کیا رسول بھی نہیں آئے گا؟ رسول کے آنے میں کیا رکاوٹ ہے؟

اس بارے میں گفتگو سے پہلے آپ کی خدمت میں ایک حکایت عرض کرتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک عورت نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اسے خلیفۂ وقت کے پاس لایا گیا اور کہا گیا کہ یہ دعویٰ کرنے کی وجہ سے تو مرتد اور کافر ہوگئی ہے۔ اس نے کہا: میں نے کیا کہا ہے؟ اس سے کہا گیا: کیا تو نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس سے کہا گیا: کیا تجھے نہیں معلوم کہ پیغمبرؐ کا ارشاد ہے: لانبیَّ بعدی. اس نے کہا: ہاں میں اس بات کو مانتی ہوں۔ لیکن پیغمبرؐ نے فرمایا ہے: لانبیَّ بعدی' انہوں نے یہ تو نہیں فرمایا کہ: لانبیّۃَ بعدی. نبی مذکر ہے اور پیغمبرؐ نے فرمایا ہے میرے بعد کوئی مذکر نبی نہیں آئے گا' انہوں نے مؤنث نبی کے بارے میں تو کچھ نہیں فرمایا۔ میں نبیۃ (مؤنث نبی) ہوں' نبی نہیں۔ لیکن افسوس سب جانتے ہیں کہ یہ ایک فضول بات ہے' کیونکہ یہاں نبی اسمِ جنس ہے اور اس میں کوئی ایسی خصوصیت جو مذکر یا مؤنث ہو نہیں پائی جاتی۔ دراصل مراد یہ ہے کہ اب خدا کی طرف سے خبر اور پیغام لے کر آنے والے کے عنوان سے کوئی نبی نہیں آئے گا۔

رسول اور نبی

رسول اور نبی کے مسئلے میں عرض ہے کہ جیسا کہ ہم نے کہا نبی یعنی پیغمبر یعنی ایسا شخص جو خدا کی طرف سے ایک پیغام کا حامل ہو۔ رسول سے کیا مراد ہے؟ رسول یعنی خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایسا شخص جسے خدا نے کوئی ذمے داری سپرد کر کے بھیجا ہو۔ اب چاہے اس ذمے داری کی

نوعیت یہ ہو کہ یہ رسول خدا کی جانب سے لوگوں کے لیے کوئی ہدایت لے کر آیا ہو یا وہ کسی اور قسم کی ذمے داری کا حامل ہو۔ صرف پہلی صورت میں یہ رسول، نبی اور پیغمبر ہے لہٰذا قرآن کریم میں رسول کا لفظ انبیا کے لیے بھی آیا ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ مثلاً اس کا اطلاق جبرئیل کے لیے بھی ہوا ہے، کیونکہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے اور انہیں ایک ذمے داری سپرد کی گئی تھی۔ سامری کی داستان میں ہے کہ: فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ. (۱) یا قرآن کے بارے میں ارشاد ہے کہ: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ. (۲) یہاں اسے رسول کہا گیا ہے۔ وہ ملائکہ جنہیں خدا نے قوم لوط پر عذاب کے لیے بھیجا تھا، انہیں بھی رسل کا نام دیا گیا ہے: وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى. (۳)

خدا نے انہیں کیوں بھیجا؟

کیا لوگوں تک قانون اور شریعت پہنچانے کے لیے؟

یقیناً نہیں۔

اسی طرح قبض روح پر مامور ملائکہ کو بھی رسل کہا گیا ہے: حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا. (۴)

وہ فرشتہ جو اس دنیا میں عذاب کے لیے آتا ہے، وہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا اور اُسکی طرف سے مبعوث کیا گیا ہوتا ہے، اور جو نبی لوگوں کو دعوت دینے کے لیے آتا ہے، وہ بھی خدا کا بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ حتیٰ لفظ ''مبعوث'' بھی صرف انبیا کے لیے مختص نہیں ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت میں بنی اسرائیل اور بخت نصر کی داستان میں، مبعوثیت کی اصطلاح اُس قوم کے لیے استعمال ہوئی ہے جسے خدا نے یہودیوں پر مسلط کیا تھا: وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ

۱۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۹۶

۲۔ سورۂ تکویر ۸۱۔ آیت ۱۹

۳۔ سورۂ ہود ۱۱۔ آیت ۶۹

۴۔ سورۂ انعام ۶۔ آیت ۶۱

فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ. (۱) قومِ عاد کے بارے میں فرماتا ہے: اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ. (۲) وہ مہلک ہوا جو ہم نے بھیجی' اسکے لیے بھی "اَرْسَلْنَا" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ وہ مہلک ہوا بھی رسول اور فرستادۂ الٰہی تھی۔

ایسا نہیں ہے کہ بعض پیغمبر نبی ہوں اور بعض رسول' بلکہ ہر پیغمبر نبی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انبیا کو اس اعتبار سے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے تھے' رسول بھی کہا گیا ہے' اسی طرح ان کے علاوہ کو بھی رسول کہا گیا ہے۔ پس لفظ "خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ" کے معنی خاتم الرسل بھی ہیں' یعنی خدا کی طرف سے لوگوں کو دعوت دینے کے لیے آخری رسول۔ پس' اگر رسول سے آپ کی مراد ایسا رسول ہو جو لوگوں کو ہلاک کرنے کے لیے آتا ہے' تو نہیں ایسا آخری رسول نہیں ہے۔ عذابِ الٰہی بھی رسول اور خدا کا فرستادہ ہے' ایک وبا (plague) جسے خدا کسی قوم پر نازل کرتا ہے' وہ بھی رسولِ خدا یعنی خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے۔ پس یہ جو بعض لوگوں نے صف قائم کی ہے اور کہا ہے کہ بعض پیغمبر نبی ہیں اور بعض رسول' اور خاتم انبیا' خاتم انبیا تھے نہ کہ خاتم رسل' یہ ایک فضول بات ہے۔ تمام انبیا رسول بھی ہیں۔ خاتم انبیا' جو لوگوں کی طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے اُن انسانوں کے خاتم ہیں جو لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے تھے۔ خود قرآنِ کریم نے بھی اس اعتبار سے رسول اور نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا ہے۔

بسا اوقات اس طرح شبہ پیدا کرتے ہیں کہ قرآن میں "نبی" سے مراد وہ پیغمبر ہے جو صاحبِ قانون اور صاحبِ شریعت نہ ہو۔ اور "رسول" وہ پیغمبر ہے جو صاحبِ قانون اور صاحبِ شریعت ہو۔ یہ ایک سراسر جھوٹا دعویٰ ہے۔ قرآن میں لفظ "نبی" کا اطلاق بعض مواقع پر صاحبِ شریعت پیغمبروں کے لیے ہوا ہے' اور بعض مواقع پر لفظ "رسول" کا اطلاق ان پیغمبروں کے لیے ہوا ہے جو صاحبِ شریعت نہیں ہیں۔ یعنی نبی اور رسول صاحبِ شریعت پیغمبر کو بھی کہا جاتا ہے اور

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۵

۲۔ سورۂ ذاریات ۵۱۔ آیت ۴۱

ایسے پیغمبر کو بھی کہتے ہیں جو صاحبِ شریعت نہ ہو۔ دونوں لفظوں (نبی اور رسول) کا اطلاق دونوں (صاحبِ شریعت اور غیر صاحبِ شریعت) ہی پر ہوتا ہے۔

یہاں ایک اور نکتہ ہے جس کا (آج ہم صرف) عنوان عرض کرتے ہیں اور اس بارے میں گفتگو آئندہ ہفتے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں اور وہ ہمارا اصل موضوع ہے کہ: آخر شریعتیں کیوں ختم ہوگئیں اور خدا کی جانب سے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے آنے والے قوانین ایک مرحلے پر آ کر ختم کیوں ہو گئے؟

وہ علل و اسباب جو پہلے پائے جاتے تھے اور اس بات کا سبب بنتے تھے کہ قوانینِ الٰہی میں بھی تبدیلی واقع ہو کیا اسکے بعد پیدا نہیں ہوئے؟

آخر ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ علل و اسباب دوبارہ پیدا نہ ہوں؟

کیا وہ علل و اسباب اقتصادی، سیاسی، علمی اور معاشرتی حالات و شرائط میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے سوا کچھ اور ہیں؟ یہ چیزیں تو مسلسل تغیر و تبدل کی حالت میں ہیں۔ پس اس صورت میں آخر کیوں کوئی شریعت آخری شریعت ہوسکتی ہے؟

انشاء اللہ آئندہ ہفتے اس موضوع کے متعلق گفتگو کریں گے اور عرض کریں گے کہ جو چیزیں انسانی معاشرے میں تبدیل ہوتی ہیں وہ کیا ہیں۔ اور وہ اصول جو انسانی معاشرے میں برقرار رہتے ہیں وہ کیا ہیں۔ اور سابقہ شریعتوں میں تبدیلی کی وجہ کیا تھی۔ اور آخری شریعت کے تبدیل نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟

تیسرا خطاب

نبوتِ تشریعی کے خاتمے کا فلسفہ

تیسرا خطاب

نبوتِ تشریعی کے خاتمے کا فلسفہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ... اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

"كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ."(۱)

خاتمیت کے بارے میں آیاتِ قرآنی پر گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد اور عقلی اور علمی پہلو سے گفتگو میں داخل ہو کر ہم نے اپنی گفتگو کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: ایک حصہ اس بارے میں ہے کہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد کیوں کوئی پیغمبر نہیں آیا' خواہ وہ پیغمبر غیر صاحبِ شریعت ہوتا؟

اور ہماری گفتگو کا دوسرا حصہ اس بارے میں ہے کہ آخر ایک مرحلے پر آ کے شریعتیں کیوں ختم ہو گئیں اور ان کے بعد کوئی شریعت نہیں آئی اور مستقبل میں بھی نہیں آئے گی؟

بالفاظِ دیگر' قرآنی نص کے مطابق انبیائے الٰہی دو قسم کے ہیں: وہ انبیا جو صاحبِ شریعت و قانون و کتاب ہیں اور خدا کی طرف سے اُن پر ایک شریعت اور کتاب نازل ہوئی ہے۔ ایسے انبیا پانچ سے زیادہ نہیں ہیں۔ حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ علیہم السلام' اور یہی وہ ہیں جنہیں قرآنِ مجید نے اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱۳

الرُّسُلِ. (۱) کے لقب سے پکارا ہے۔ {ان کے علاوہ} وہ انبیا تھے جو یا تو لوگوں کو ان شریعتوں اور قوانین کی طرف دعوت دیتے تھے' یا وہ حضرت نوحؑ سے پہلے ہوا کرتے تھے' لوگوں کے لیے کوئی شریعت یا کتاب آنے سے پہلے۔ اسکی کیا صورت تھی' ہم بعد میں اسکی وضاحت کریں گے۔

بہرحال کیونکہ بعض انبیا صاحبِ شریعت ہیں' اور بعض نہیں' لہٰذا ہماری یہ گفتگو دو حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ایک یہ ہے کہ درست ہے کہ ہمارے نبیؐ صاحبِ شریعت ہیں' لیکن جس طرح حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ کے بعد ہزاروں انبیا اور حضرت عیسیٰؑ کے بعد سینکڑوں انبیا ان کی شریعتوں کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کے لیے آئے' اُس طرح خاتم الانبیا کے بعد ایسے انبیا کیوں نہیں آئے جن کی ذمے داری لوگوں کو اس شریعت کی جانب دعوت دینا ہوتی اور جو واقعاً اس شریعت کے مبلّغ اور مروّج ہوتے' اس شریعت کی روشنی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہوتے؟

اس بارے میں ہم نے گزشتہ ہفتے گفتگو کی تھی' اب اسے دُہرانا نہیں چاہتے' لیکن کیونکہ اس جلسے کے بعد بعض دوستوں نے ایک انتہائی بجا سوال کیا تھا' لہٰذا ہم اس سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ہم نے یہ کہا تھا کہ اُن آنے والے انبیا کا کام ان شریعتوں کی طرف دعوت اور ان کی تبلیغ ہوتا تھا' اور اُن زمانوں اور ادوار میں تبلیغ کا ذریعہ ایسے انبیا کے علاوہ کوئی اور نہ تھا جنہیں وحی کے ذریعے الہام کیا جاتا۔ ایسا کیوں تھا؟ اس لیے تھا کہ ابھی وہ زمانہ انسان کی کم سنی کا دور تھا' علم' کتاب اور ایسے علما کا دور نہ تھا جو اپنے علم کے ذریعے سے: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ. (۲) کا فریضہ انجام دیں' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں' اور ان ذرائع سے دین کی حفاظت کریں' انبیا کے جانشین بنیں۔ اُن ادوار میں ایسا ممکن بھی نہ تھا۔ اُس دور میں یہ فریضہ انبیا علم اور درس حاصل کر کے نہیں بلکہ وحی کے ذریعے انجام دیا کرتے تھے۔ اور ہم

۱۔ سورۂ احقاف ۴۶۔ آیت ۳۵

۲۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۱۲۵ {آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے دعوت دیں}

نے عرض کیا تھا کہ کلی طور پر حیوان، جس میں انسان بھی شامل ہے، جتنا ناقص ہوگا اتنی ہی اس کی ہدایت کی راہ الہامات سے وابستہ ہوگی، اور جتنا کامل ہوتا چلا جائے گا اتنی ہی زیادہ اسکی ہدایت فکر سے وابستہ ہوتی چلی جائے گی۔

شیعہ نقطۂ نظر سے ضرورتِ امام کے بارے میں شبہ

محترم احباب کا سوال یہ ہے کہ اگر آخری شریعت میں کسی نبی کی، یعنی کسی ایسی ہستی کی ضرورت نہیں جس پر خدا کی طرف سے وحی اور الہام ہوتا ہو اور جسے خدا کی تائید حاصل ہو، اور یہ کام علما، حکما اور فقہا انجام دے سکتے ہیں، وہی جن کے بارے میں پیغمبرؐ نے فرمایا ہے: عُلَمَاءُ اُمَّتِی کَاَنْبِیَاءِ بَنِی اِسْرَائِیلَ. (میری امت کے علما، بنی اسرائیل کے انبیا کی طرح ہیں) تو پھر امام کی کیا ضرورت ہے، اور شیعہ نقطۂ نظر سے اس بات کی توجیہ کس طرح کی جا سکتی ہے؟

اگر ایسا ہے، تو پھر ایسے انبیا کی ضرورت ہی نہیں جو دین کے مروّج اور مبلّغ ہوں، جو لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہوں، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہوں۔ امامِ معصوم کی بھی ضرورت نہیں۔ {ان لوگوں کا} یہ سوال بے جا نہیں ہے۔

رہا اس سوال کا جواب، تو وہ یہ ہے کہ امام اور پیغمبر کے موضوع میں دو مسئلے ہیں۔ ایک یہ کہ امام اور پیغمبر کے درمیان کیا فرق ہے؟ البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امام یعنی وہ ہستی جو صاحبِ شریعت نہ ہو، کیونکہ اکثر پیغمبر بھی صاحبِ شریعت نہیں تھے۔ یہ بات یقینی ہے کہ پیغمبر اور امام کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ اگر فرق نہ ہوتا، تو ہمیں متعین کر کے یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ علی ابن ابی طالب پیغمبر نہیں امام ہیں، لیکن پیغمبروں کے تمام کام انجام دیتے ہیں۔

کیا امام کا درجہ پیغمبر سے کچھ کم ہے اور اس کا تعلق درجے اور رتبے سے ہے؟

اور کیا ائمہ تمام انبیا سے ایک درجہ کم تر ہیں؟

نہیں، ایسا نہیں ہے، اگر اس امت کے علما میں سے کوئی عالم پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر پر فضیلت رکھتا ہو، تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔

پس {ایسا} کس اعتبار سے ہے؟

اس بارے میں دو پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے۔ایک اس پہلو سے کہ امام اور پیغمبر دونوں ہی دنیائے غیب سے رابطہ رکھتے ہیں۔البتہ ان کے رابطے کی کیفیت میں فرق ہوتا ہے۔مثلاً انبیا ملائکہ کو دیکھتے ہیں' لیکن امام نہیں دیکھتے' یا انبیا کو خواب میں بھی بعض امور بتائے جاتے ہیں' لیکن امام صرف سنتے ہیں' نہ امام دیکھتے ہیں اور نہ انہیں خواب میں کوئی چیز بتائی جاتی ہے۔

کیا (امام اور پیغمبر کے درمیان) بس صرف یہی فرق ہے؟

ممکن ہے ایک پہلو سے شاید یہی فرق ہو۔کیونکہ ہم وحی اور الہام کی حقیقت کے بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔اگر امام اور پیغمبر کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ دوسری دنیا سے علیحدہ علیحدہ طریقے سے حقائق کسب کرتے ہیں' تو پھر جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا بیان یہ تھا کہ امت کے علما اور دانشور یہ فرائض انجام دیتے ہیں' لہٰذا پھر امام کی کیا ضرورت ہے؟ اب امام چاہے ملائکہ کو دیکھے یا اُن کی آواز سنے' کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لیکن امام اور پیغمبر کے درمیان واحد فرق بس یہی نہیں ہے کہ اُن کے عالمِ غیب سے علم حاصل کرنے کا طریقہ مختلف ہے' بلکہ وہ فریضے کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس عنوان سے نمایاں ترین بات یہ ہے کہ صاحبِ شریعت انبیا کا فریضہ یہ تھا کہ وہ وحی کے ذریعے ایک شریعت حاصل کرتے تھے' اور پھر اس بات کے پابند تھے کہ لوگوں کو اسکی طرف دعوت دیں' اسکی تبلیغ کریں' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔اُن کا فریضہ تھا کہ وہ تبلیغ' ترویج اور دعوت کے لیے لوگوں کے درمیان جائیں۔وہ انبیا بھی جو صاحبِ شریعت نہ تھے' دعوت' تبلیغ اور ترویج اُن کا بھی فریضہ تھا۔امام نہ تو شریعت اور قانون لاتا ہے' اور نہ ہی اس پہلو سے کہ وہ امام ہے (اس پہلو سے نہیں کہ مومنین میں سے ایک مومن یا علما میں سے ایک عالم ہے) اُس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے پاس جا کر انہیں دعوت و تبلیغ کرے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ یعنی دعوت' تبلیغ' ترویج' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس بنا پر امام کا فریضہ نہیں ہے کہ وہ امام ہے' بلکہ یہ تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے اور وہ بھی اُن لوگوں میں سے ایک ہے جن پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے۔اگر امام حسینؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے قیام فرمایا' تو یہ اس بنا پر نہ تھا

کہ آپؑ امامِ وقت ہیں اور امامِ وقت پر ایسا کوئی فریضہ عائد ہوتا ہے' بلکہ آپؑ پر ایک ایسا فریضہ عائد ہوتا تھا جو اُس وقت ہر صاحبِ بصیرت مومن کا فرض تھا۔ لہٰذا خود آپؑ نے بھی کبھی اس فریضے کو امامت تک محدود نہیں کیا' آپؑ فرماتے تھے: اَلا تَرَوْنَ اَنَّ الْحَقَّ لایُعْمَلُ بِهٖ وَاَنَّ الْبَاطِلَ لا یُتَنَاهیٰ عَنْهُ. کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا' اور لوگ باطل سے پرہیز نہیں کر رہے' لِیَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ فی لِقاءِ اللّٰهِ مُحِقّاً. (۱) لہٰذا ایک صاحبِ ایمان فرد کو ایسی زندگی سے بیزار اور شہادت کا طلبگار ہونا چاہیے۔

پس پھر امام کا فریضہ کیا ہے؟

امام اختلافات کے حل کے لیے ایک مرجع کی حیثیت رکھتا ہے' اور جن اختلافات کا سبب خود علما ہیں اُن کے حل کے لیے ایک رہنما ہے۔ آپ بہت سی شیعہ روایات میں دیکھیں گے کہ وہ کہتی ہیں: اَلْاِمامُ یُؤْتیٰ وَلایَاْتی. یعنی امام کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے پیچھے جائے' بلکہ لوگوں کو اُسکے پاس آنا چاہیے۔ یا ایک اور روایت میں فرمایا گیا ہے: اَلْاِمامُ کَالْکَعْبَةِ. امام کعبہ کی مانند ہے۔ کعبہ لوگوں کے پاس نہیں جاتا' بلکہ لوگوں کی ذمے داری ہے کہ وہ کعبہ کے پاس آئیں۔ یہ آیہ کریمہ جو فرماتی ہے: وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ. (۲) اسکے بارے میں احادیث میں ہے کہ اس سے مراد پیغمبر ہیں' اس اعتبار سے کہ وہ امام ہیں' اور تمام ائمہؑ اس آیت کے مصداق ہیں۔ لوگوں کی ذمے داری ہے کہ جب وہ حج کے لیے جائیں' تو اپنے امام کے پاس بھی جائیں۔

یہ مسئلہ آخری شریعت میں بھی پیش آئے گا۔ یعنی بعض اختلافات' تفرقے' تنازعات اور مختلف و گوناگوں مذاہب آخری شریعت میں بھی پیدا ہوں گے۔ لہٰذا ایک ایسا رہنما ہونا چاہیے کہ اگر لوگ اپنی خواہشات اور تعصبات کی بنا پر خود اپنے ہاتھوں ایجاد کردہ ان مختلف مذاہب میں سے یہ جاننا چاہیں کہ حق کیا ہے' تو اسکے پاس جائیں۔

۱۔ لہوف۔ ص ۳۳

۲۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۲۷

جب آپ ائمۂ اطہار علیہم السلام کے اندازِ کار کا مطالعہ کرتے ہیں' تو وہاں دیکھتے ہیں کہ آپ حضراتؑ نے امامت کی ذمے داری پر فائز ہونے کی بنا پر' لوگوں سے اسکے سوا کچھ اور نہیں کہا کہ ہم امام ہیں اور تمہاری ذمے داری ہے کہ تم آؤ اور ہم سے اپنی مشکلات کے متعلق دریافت کرو۔

پس امام اور نبی (چاہے وہ صاحبِ شریعت ہو' چاہے غیر صاحبِ شریعت) کے درمیان فرق صرف {ان پر ہونے والے} الہامات کی نوعیت اور کیفیت میں نہیں ہے' کہ کیا وہ فرشتے کو دیکھتے ہیں {یا نہیں}' اُس کی آواز سنتے ہیں یا نہیں' ایسا خواب میں ہوتا ہے' یا عالمِ بیداری میں' بلکہ انبیاؑ اور ائمہؑ کے فرائض اور ذمے داریوں میں بھی فرق ہے۔ اور یہ فریضہ اُس فریضے سے مختلف ہے جس کے متعلق ہم نے عرض کیا کہ علمائے امت اُس میں پیغمبر کے جانشین ہیں۔ علمائے امت {دین کی} دعوت' تبلیغ اور ترویج کے کام میں پیغمبر کے جانشین بن سکتے ہیں' لیکن اختلافات کے حل کا مرجع نہیں بن سکتے۔

قرآن کی نظر میں انبیاؑ کو بھیجنے کا مقصد

قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے' ایک عجیب آیت ہے' یہ وہی آیت ہے جسے ہم نے آغازِ کلام میں پڑھا تھا (سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۳) یہ عجیب ترین آیات میں سے ہے' جو بعثت و نبوت اور انبیا کو بھیجنے کے مقصد کے بارے میں ہے۔ اس آیت کے مفہوم میں غور فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً. تمام انسان ایک واحد گروہ اور جمعیت تھے۔ یعنی انسانوں کے درمیان کوئی اختلاف اور تفرقہ نہ تھا۔ یعنی انسان پر ایک ایسا دور گزرا ہے جس میں افرادِ بشر کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔

میرے عقیدے کے مطابق یہ قرآن کی معجزانہ آیات میں سے ایک آیت ہے۔ دورِ حاضر کے تاریخِ تمدن تحریر کرنے والے' اور تاریخِ انسانی پر تحقیق کرنے والے حال ہی میں اس نکتے پر پہنچے ہیں کہ جب اوّلین بار انسان کی اجتماعی زندگی شروع ہوئی ہے' تو سادگی اور وحدت کے ساتھ شروع ہوئی ہے۔ صرف کمیونسٹ ہی نہیں' بلکہ وہ لوگ بھی جو کمیونسٹ نہیں ہیں' وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ ابتدا میں انسانی زندگی ایک ایسی شکل میں تھی کہ حتیٰ مالکیت کا بھی وجود نہ تھا۔ تمام افراد ایک

گھرانے کی طرح بھائیوں کی مانند زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں لوگوں کے ایک ساتھ اکٹھے رہنے کی وجہ دشمنوں کا خوف تھی۔ اُن کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کی وجہ سے اُن کے درمیان جنگ، نزاع اور اختلاف ہوتا۔ اس وقت تک ذاتی ملکیت کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً. تمام لوگ ایک ملت، ایک اکائی اور ایک امت تھے۔ اُن کے درمیان کسی قسم کا مزاجی اختلاف، عقیدتی اختلاف، طرزِ عمل کا اختلاف، اور حتیٰ طرزِ حیات کا اختلاف بھی موجود نہ تھا۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (۱) خدا نے اس وقت انبیا کو مبعوث فرمایا، جو مبشر بھی تھے اور منذر (ڈرانے والے) بھی، اور جو لوگوں کو بشارت دیا کرتے کہ اگر تم نے اِس طرح عمل کیا تو ایسا ہوگا اور اُس طرح عمل کیا تو ویسا ہوگا۔ اور اُن کے ساتھ کتاب (یہاں کتاب سے مراد شریعت اور قانون ہے) بھی نازل فرمائی۔ کس لیے؟ اس لیے، تاکہ اس قانون کے ذریعے لوگوں کے اختلافی امور میں فیصلے کیے جائیں۔ یعنی جب اُن کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو، تو ایک قانون موجود ہو جس کے ذریعے سے اُن کے اختلاف کو حل کیا جائے۔ یہاں سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں، یہاں خدا نے ایک چیز مقرر فرما دی تھی، اور یوں ہوا کہ:

ایک زمانے میں تمام لوگ امتِ واحدہ تھے، اُن کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا، بعد میں اُن کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا، اور جب اُن کے درمیان اختلاف پیدا ہوا، تو خدا نے ان کے لیے قانون اور کتاب نازل کی، تاکہ یہ کتاب لوگوں کی زندگی میں پیدا ہونے والے اختلافات کو حل کرے۔

ایک زمانہ انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جس میں اسکے پاس کوئی کتاب اور کوئی قانون نہ تھا، اور اُسے قانون کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ بعد میں انسانوں کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگے۔

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱۳

اختلاف کیوں پیدا ہوئے؟

ہم نے عرض کیا تھا کہ ابتدا میں لوگوں کے درمیان اختلاف کی کوئی وجہ ہی نہ تھی' بعد میں جب انسانی زندگی میں وسعت پیدا ہونا شروع ہوئی' اور اُس نے کائنات میں موجود نعمتوں سے استفادے کے بارے میں سوچنا شروع کیا' تو قدرتی طور پر کچھ لوگ طاقتور تھے اور کچھ کمزور' لہٰذا طاقتور لوگوں نے زیادہ حصہ سمیٹ لیا اور کمزور لوگ محروم رہ گئے' اور طاقتور کمزوروں کو اپنا خادم بنانے لگے۔ یہیں سے اختلافات پیدا ہونا شروع ہوئے۔ کیونکہ لوگ جو پہلے ایک خاندان کی طرح زندگی بسر کرتے تھے' اب اُن کے تعلقات میں اختلافات اور سرد مہریاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں' {اسکے بعد} لوگوں کے درمیان ایک عادلانہ قانون آیا' جس نے کہا کہ قوی اور طاقتور کو کمزور اور ناتواں کا حق ہڑپ کرنے کا کوئی اختیار نہیں' طاقتور کا بھی حق ہے' کمزور کا بھی حق ہے' اسی طرح بڑوں چھوٹوں سب کے حقوق ہیں' اور سب کے لیے عدالت ہے۔

قرآنِ مجید میں ایک اور آیت ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا. (۱) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوّلین شریعت' قانون اور کتاب جو دنیا میں نازل ہوئی' اُس کا تعلق حضرت نوحؑ سے تھا۔ اگر آپ ان دو آیات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھیں' {تو پتا چلتا ہے کہ} حضرت نوحؑ کی بعثت اُس زمانے میں ہوئی جب تاریخِ تمدن کی نظر میں افرادِ بشر کی سطحِ زندگی میں اختلاف کا آغاز ہوا تھا' اور آج کے لوگوں کے خیال میں مطلق (absolute) اشتراکیت کے دور کے خاتمے کے بعد غلامی کا دور شروع ہوا تھا' جس میں بعض انسان بعض دوسرے انسانوں کو غلاموں کی طرح اپنی خدمت پر مامور کر لیتے تھے۔ قرآن کی نظر میں جب پہلی مرتبہ افرادِ بشر کی سطحِ زندگی میں اختلاف رونما ہوا' اور انہوں نے ایک دوسرے کا استحصال شروع کیا' تو حضرت نوحؑ کی شریعت نازل ہوئی۔

اگر پوچھا جائے کہ حضرت نوحؑ سے پہلے کیا صورتحال تھی؟

کیا اُن سے پہلے کوئی نبی نہیں تھا؟

۱۔ سورۂ شوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۳

حضرت نوحؑ سے قبل نبی تھے' لیکن کتاب اور قانون نہیں تھا۔

انبیا کا فریضہ محض یہ نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے لیے قانونِ اجتماعی لے کر آئیں۔ انبیا کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیں۔ {حضرت نوحؑ سے پہلے} ایسے انبیا تھے جو لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے تھے' اسی سادہ زندگی {اور ماحول} میں انسانوں کو خدا کی عبادت و پرستش کی طرف دعوت دیا کرتے تھے' اور فرائض عبادات کی قسم سے ہوا کرتے تھے۔ یہ انبیا لوگوں کو مبدا {خدا} اور معاد {قیامت} کی طرف دعوت دیتے تھے' اور لوگوں کو کچھ انفرادی' اخلاقی اور عبادی احکام سے آشنا کرتے تھے۔ حضرت ادریسؑ' حضرت نوحؑ سے پہلے آنے والے انبیا میں سے تھے' وہ صاحبِ کتاب نہیں تھے' یعنی انہوں نے کوئی شریعت پیش نہیں کی' اور لوگوں کے لیے کوئی قانونِ اجتماعی لے کر نہیں آئے' لیکن وہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیا کرتے تھے' انہیں قیامت کی طرف دعوت دیتے تھے' اور انہیں قیامت سے متعارف کرایا کرتے تھے' لوگوں کو تقویٰ' عبادت اور اخلاق کی دعوت دیتے تھے' انہیں تقویٰ' عبادت اور اخلاق سے روشناس کراتے تھے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً . ایک زمانے میں لوگ امت واحدہ اور یک رنگ تھے' اُن کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا' انہیں کسی ایسے قانون کی ضرورت نہ تھی جو اُن کے اجتماعی تعلقات میں پیدا ہونے والے اختلافات کو ختم کرے۔ پھر ان کے درمیان اختلاف اور تفاوت پیدا ہوگیا' اور خدا نے صاحبِ کتاب انبیا بھیجے جن کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے ہوا : فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. انبیا کو بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور قانون نازل کیا تاکہ وہ کتاب اور قانون لوگوں کے درمیان حاکم ہو۔

یہاں سے اسکے بعد' قرآن ایک ثانوی اختلاف کو بیان کرتا ہے' اور کہتا ہے کہ لوگوں کے پاس قانونِ اجتماعی آجانے کے بعد' وہ قانون اجتماعی جو ان کے درمیان پھوٹ پڑنے والے اجتماعی اختلافات کو حل کرے' لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرے' ظلم و ستم کا راستہ

رو کے مظلوم کی مدد کرے اور اجتماعی روابط میں حسن پیدا کرے۔ جی ہاں آسمانی قوانین آجانے کے بعد یہ {قوانین} خود افرادِ بشر کے درمیان ایک اور اختلاف کا سبب بن گئے۔ کیا اختلاف رونما ہوا؟ مذہبی اختلافات {پیدا ہو گئے}۔ کوئی نبی ایک کتاب کے ساتھ آتا اسکے بعد اس دین کا ایک پیروکار ایک ایسا شخص جو دوسروں سے زیادہ ذہین ہوتا تھا وہ آتا اور اس دین میں ایک بدعت ایجاد کر دیتا ایک دوسرا اٹھتا اور ایک اور بدعت ایجاد کر دیتا اور رفتہ رفتہ اس سے ایک علیحدہ مذہب پھوٹ پڑتا۔ اسی طرح جیسے ہر شریعت میں مختلف مذاہب پیدا ہوئے ہیں۔

اس وقت اوّلین صاحبِ شریعت نبی حضرت نوحؑ کے بعد آنے والے انبیا اور اُن کے لائے ہوئے قوانین دو اختلافات کے حل کے لیے تھے۔ ایک تو یہ زندگی کے معاملات و امور میں لوگوں کے اختلاف ختم کرانے کے لیے تھے یعنی یہ انبیا لوگوں کی زندگی کے لیے قانون لے کر آئے اور ان کے آنے کا دوسرا سبب: باطل عقائد نظریات اور خواہشات کو منسوخ کرنا تھا۔ وہ کہتے تھے یہ کیا باتیں کیا کرتے ہو تم نے یہ کیا مختلف مذاہب اختیار کیے ہوئے ہیں؟

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔ (۱) ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی بلکہ وہ حق کے متلاشی حق طلب اور حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے تھے۔ یہودیت اور نصرانیت دو مختلف مذاہب کی صورت میں وہ انحرافی راستے ہیں جنہیں خود انسان نے اس شاہراہ میں ایجاد کیا ہے جس کی خداوندِ عالم نے حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے نشاندہی کی تھی۔ قرآنِ کریم اس دوسرے اختلاف کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ۔" (۲)

یہ دوسرا اختلاف جو خود دین میں پیدا ہونے والا اختلاف ہے یہ مفاد پرستوں اور ہوئی وہوس کے پجاریوں کی طرف سے پیدا کیا گیا ہے یہ جہل و نادانی اور کوتاہی کی وجہ سے پیدا نہیں

۱۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۶۷

۲۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱۳

ہوا۔ ایسا نہیں تھا کہ کیونکہ لاعلم تھے اس لیے اختلاف کرتے تھے بلکہ جانتے بوجھتے اختلاف کرتے تھے سمجھتے تھے اور حقیقت کو چھپاتے تھے جانتے تھے پھر بھی ایک چیز کا اضافہ کر دیتے تھے۔ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ. (جن لوگوں کو کتاب دی گئی) اور انہوں نے اختلاف نہیں کیا" اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا" بَيْنَهُمْ. (۱) مگر اس کتاب کا علم رکھنے کے باوجود سرکشی، ظلم، عصیان اور نفسانی خواہش کی بنا پر۔

پس (سب سے پہلے صاحب شریعت نبی کے سوا) تمام صاحب شریعت انبیاء دو کام کیا کرتے تھے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے لیے قانون لاتے تھے تاکہ یہ قانون لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو حل کرے اور ان کے حقوق اور حدود کا تعین کرے۔ ان کا ایک دوسرا کام یہ ہوتا تھا کہ یہ پہلے پیدا ہو چکنے والی بدعتوں کے خلاف جنگ کرتے تھے یعنی یہ مذہبی اختلافات کے حل کا مرکز تھے۔ امام کا کام صرف اس دوسرے حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ امام صرف اس ثانی الذکر حصے میں پیغمبر کا جانشین ہے۔ یعنی امام لوگوں کے درمیان حجت خدا ہے اور اس کا فریضہ یہ ہے کہ ہوئی و ہوس کے پجاری بدعتیں ایجاد کرنے والے لوگ اور مفاد پرست عناصر جو اختلافات وجود میں لاتے ہیں ان کا خاتمہ کرے۔ امام ان اختلافات کے حل کے لیے کافی اور کامل صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔

تمدن کے ادوار سے شریعتوں کے منسوخ ہونے کا تعلق

اب ہم اس دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں جو زیادہ اہم حصہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آخر کیوں ایک خاص وقت پر آ کے الٰہی شریعتیں اور قوانین ختم ہو گئے اور اب ان کے بعد دنیا میں کوئی قانون نہیں آئے گا حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. (۲) ایسا کیوں ہے؟

۱۔ سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۹

۲۔ اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۱۷

اور جب اُن سے پوچھتے ہیں کہ کیا تمہیں اسکے علاوہ کسی اور بات کی توقع تھی' تو وہ کہتے ہیں: ہاں' یہ گزشتہ شریعتیں جو تبدیل اور منسوخ ہوگئیں' کیا اسکی وجہ اسکے سوا کچھ اور ہے کہ انسان کے علم اور تمدن میں تبدیلی واقع ہوگئی تھی؟

کیونکہ انسان کے علم اور اسکے تمدن میں تبدیلی رونما ہوئی تھی' اس لیے انسان کے لیے قانون میں بھی تبدیلی واقع ہوگئی۔ جس طرح علم اور تمدن میں خاتم الانبیاؐ سے پہلے تبدیلی واقع ہوئی تھی' اور جس نے انسان کو بدل دیا تھا' تبدیلیوں کا یہ سلسلہ خاتم الانبیاؐ کے بعد بھی متوقف نہیں ہوا ہے' بلکہ مسلسل جاری وساری ہے اور اسکے نتیجے میں انسان میں بھی تبدیلیا رونما ہوتی رہتی ہیں۔ پس انسان کو ایک دوسرے قانون اور شریعت کی ضرورت ہے۔

اس مسئلے کو وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلے ہم ایک نکتے کو انتہائی اجمال کے ساتھ عرض کریں گے' اور وہ یہ ہے کہ: آپ کے ذہن میں یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ گزشتہ شریعتوں کا آخری شریعت کے ساتھ اختلاف اصطلاحاً ایک تباینی اختلاف ہے' ان کے درمیان سرمایہ داری (capitalism) اور اشتراکیت (communism) کی طرح ایک تضاد کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ {نہیں' بلکہ ان کے درمیان} اختلاف فروعی نوعیت کا ہے۔ یعنی کیا؟ یعنی ان دونوں قوانین کی روح ایک ہی چیز ہے' اور وہ وہی ہے جو آخری شریعت میں بیان ہوچکی ہے۔ وہی چیز جو آخری شریعت میں ہے اسکے فروع اور جزئیات مختلف زمانوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ یہ آخری شریعت سے قبل کے زمانوں میں بھی مختلف ہوا کرتے تھے' بعد کے زمانے میں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پہلے زمانے میں یہ کام انبیا انجام دیا کرتے تھے' اور بعد کے زمانے میں علما کو چاہیے کہ وہ اسے اجتہاد کے ذریعے انجام دیں۔ شریعتیں ایک سے زیادہ نہیں ہیں' اس بات کی ہم آگے چل کر مزید وضاحت کریں گے۔

لیکن اجمالی طور پر یہ بات جان لیجیے کہ شریعتوں میں پائے جانے والے اختلاف کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ یہ ایک دوسرے سے متضاد ہوں۔ یعنی یہ دو مختلف نظاموں کی مانند نہیں ہیں' سرمایہ داری اور اشتراکیت کی طرح نہیں ہیں' جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

بات کو ہم بنیاد سے شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کہنا سرے سے غلط ہے کہ شریعتوں میں تبدیلی کی وجہ انسانی علم وتمدن میں تبدیلیاں پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا کے پاس جاہل انسان کے لیے ایک قانون ہے اور عالم انسان کے لیے دوسرا قانون' غیر متمدن انسان کے لیے ایک قانون ہے اور متمدن کے لیے دوسرا قانون۔

نہیں' ایسا نہیں ہے۔ معاملہ یوں نہیں ہے' بلکہ ایک اور طرح سے ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تغیر پذیر نہیں ہیں۔

کس طرح؟

آپ دیکھئے انبیا کیوں آئے ہیں؟ کس خلا کو پُر کرنے کے لیے آئے ہیں؟

اس موقع پر آپ دیکھیں گے کہ وہ چیزیں تغیر پذیر نہیں ہیں۔ وہ کام جن کے لیے انبیا آئے ہیں' اُن میں سے ایک خدا کی طرف دعوت دینا ہے' یعنی اُنہوں نے خدا اور بندے کے درمیان رابطہ برقرار کیا۔ مراد یہ ہے کہ انہوں نے ایک طرف تو بندے کو خداشناس بنایا اور دوسری طرف اسے خدا کا عبادت گزار بنایا۔

میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ: کیا خدا کا عرفان اور اسی طرح خدا کی پرستش اور اُس کا تقرب وہ چیزیں ہیں جن کا قاعدہ مختلف زمانوں میں مختلف ہو جاتا ہے؟

مثلاً کیا فزکس اور کیمسٹری کی ترقی سے خدا کے عرفان کا قاعدہ بدل جائے گا؟

انبیا اس مقصد کے لیے آئے ہیں' تاکہ ایک تو انسان کو خود اپنے آپ سے روشناس کرائیں' کیونکہ انبیا کے سوا کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔

اسے کس طرح خود اپنے آپ سے روشناس کرائیں؟

اس طرح کہ اُس سے کہیں کہ: اے انسان! تو ایک فنا پذیر' زائل اور معدوم ہو جانے والا موجود نہیں ہے' اس دنیا میں تیری زندگی تیری حیات کا ایک مرحلہ ہے' تیری ابدی حیات ایک دوسری دنیا میں ہے۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ کوئی ایسا موضوع ہے جو انسانی تمدن کے مختلف ادوار

میں مختلف ہوگا؟ {آپ جواب دیں گے} نہیں۔

انبیا انسان کو معرفتِ نفس کی بنیاد پر تہذیبِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔ کیا تہذیبِ اخلاق سے متعلق مختلف احکام مختلف زمانوں میں مختلف ہو جاتے ہیں؟ تمام انبیا اس مقصد کے لیے آئے ہیں کہ خود پرستی اور خود خواہی کو انسان کے نفسانی امراض کے لیے ام الامراض کے طور پر متعارف کرائیں اور اسکی بنیاد پر خود پرستی اور خود خواہی کے خلاف جنگ کریں اور خدا کی وحدانیت اور خداپرستی کی بنیاد پر افرادِ بشر کو ایک دوسرے کے لیے مہربان بنائیں۔

ممکن ہے کہا جائے کہ اخلاق تو نسبی (relative) ہوتا ہے لیکن یہ بات درست نہیں اخلاق نسبی نہیں ہوتا۔ ہم آگے چل کر اس بارے میں گفتگو کریں گے۔ حضرت ابراہیم کے زمانے میں انسانی نفس انہی خصوصیات کا مالک تھا اور اُسے اسی تہذیب کی ضرورت تھی خاتم الانبیاؐ کے زمانے میں بھی اسی طرح تھا ہمارے دور میں بھی ایسا ہی ہے۔

ایک اور کام جو انبیا کیا کرتے تھے وہ یہ تھا کہ وہ انسانوں کے باہمی روابط میں توازن پیدا کرتے تھے: لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۱) یہی وہ مقام ہے جس پر لوگوں کی اکثریت کہتی ہے کہ تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

طیّبات کے حلال اور خبائث کے حرام ہونے کا اصول

انبیا علیہم السلام کے کاموں میں سے ایک اور کام یہ ہے کہ وہ کائنات کے ساتھ انسان کے روابط کا تعین کرتے ہیں کہتے ہیں: هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا. (۲) ہر چیز تیرے ہی لیے خلق کی گئی ہے لیکن اشیائے عالم کے درمیان ایسی چیزیں بھی ہیں جن میں تیری مصلحت نہیں ہے یعنی تیری خلقت کے لیے مناسب نہیں کہ تو ان سے استفادہ کرے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ سُور کا گوشت نہ کھاؤ شراب نوش نہ کرو اور درندوں اور جنگلی جانوروں کا گوشت نہ کھاؤ: وَ

۱۔ سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵

۲۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۹

یُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۱) (خدا) اُن تمام چیزوں کو جو اُن (انبیا کے پیروکاروں) کے لیے بہتر اور مناسب ہیں حلال کرتا ہے اور جو اُن کے لیے بہتر اور مناسب نہیں انہیں حرام قرار دیتا ہے۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں: انسان اور کائنات کے روابط کے لحاظ سے یہ چیزیں جن کے بارے میں قرآن نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام انسانی علم و صنعت میں رونما ہونے والے اتنے سارے تغیرات کے بعد اُن میں سے کونسی چیز میں تغیر واقع ہوا ہے؟

کیا مشروبات اپنی ماہیت کھو بیٹھے ہیں اور کیا اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَۃَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ (۲) منسوخ ہو چکا ہے؟ اور کیا اس قابل ہے کہ اسے منسوخ کیا جا سکے؟ کیا سُور کے گوشت کی خاصیت بدل چکی ہے؟ کیا ممکن ہے آپ یہ کہہ سکیں کہ ہاں، ہمیں سُور کے گوشت کی حرمت کا فلسفہ پتا چل گیا ہے۔ اس بارے میں ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔

ملبوسات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ مرد حریر اور ابریشم نہ پہنے اور سونے کا زیور استعمال نہ کرے۔ کیا یہ اُن مسائل میں سے ہیں کہ مثلاً ایک زمانے میں درست تھے اور دوسرے زمانے میں درست نہیں ہیں؟ یا ان کی حکمت اور فلسفہ ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ سماعت سے متعلق چیزوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ایسی آوازیں جو دیوانہ وار شہوت کو بھڑکائیں اور عقل کی کمزوری کا سبب بنیں اور ایک قسم کا جنون اور مستی پیدا کریں اُن کا سننا ممنوع ہے۔ اور دیکھنے سے متعلق چیزوں کے بارے میں کہا گیا ہے: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ .... وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ

۱۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۵۷

۲۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۹۱ {شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے تمہارے درمیان بغض و عداوت پیدا کر دے}

مِنْ اَبْصَارِهِنَّ ۔(۱) ''ہیجان انگیز مناظر نہ دیکھو''۔ مثلاً اگر دنیا ٹین (Tin) کے دور سے تعلق رکھتی ہو یا لوہے کے دور سے' یا ایٹم کے دور سے' تو کیا اس پہلو سے {اس میں} فرق پڑتا ہے؟

ملموسات کے حوالے سے بھی اسی طرح ہے' اجنبی کے بدن کو بغیر درمیان میں کوئی چیز رکھے چھونا حرام ہے۔ انسانوں کے درمیان روابط کے حوالے سے جو کچھ اسلام نے وضع کیا ہے' کیا اُس میں واقعاً آپ کوئی ایسا مورد لا سکتے ہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ زمانے کے تغیرات وتحولات نے اسے منسوخ کر دیا ہے؟

غلامی کا مسئلہ

ممکن ہے کوئی اسکی توڑ کے طور پر غلامی کے قانون کی مثال پیش کرے اور کہے کہ اسلام نے غلامی کے قانون کی توثیق کی ہے' جبکہ آج کی دنیا میں یہ قانون منسوخ ہو چکا ہے۔ پس آج کی دنیا میں غلامی کو سرے سے ہونا ہی نہیں چاہیے' لہٰذا اسلامی قانون کا کچھ حصہ منسوخ ہے۔

اس بات کا جواب ہم یہ دیں گے کہ یہ ایک انتہائی باطل تصور ہے۔ اولاً تو اسلام غلامی کے باب میں کوئی قانون لایا ہی نہیں ہے' جس کی رو سے وہ غلامی کو معاشرے کے لیے لازم سمجھتا ہو جیسے کہ بعض قدیم فلاسفہ کا خیال تھا اور وہ معاشرے کے لیے غلامی کو ضروری سمجھتے تھے۔

غلامی کے بارے میں اسلام نے جو پروگرام پیش کیا ہے' وہ غلامی { کو فروغ دینے اور اسے باقی رکھنے } کا پروگرام نہیں' بلکہ {غلاموں کی} آزادی کا پروگرام ہے۔ اس حصے کی جانب بعض حضرات نے توجہ دی ہے' اور بہت عمدہ طریقے سے متوجہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فقہ اسلامی میں ہمارے پاس ''کتاب الرِّق'' {یعنی غلام بنانے کا باب} نہیں ہے' بلکہ ''کتاب العتق'' {یعنی غلاموں کو آزاد کرنے کا باب} موجود ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کہا ہے کہ {معاشرے میں} لازماً غلامی کا وجود ہونا چاہیے' تاکہ اس طرح اور اُس طرح ہو سکے' {بلکہ} اسلام نے اپنے پورے پروگرام کو اس انداز سے ترتیب دیا ہے' جس سے غلاموں کو آزاد کرنے کی راہیں نکل سکیں۔

۱۔ سورہ نور ۲۴۔ آیت ۳۰' ۳۱

لوگوں کی بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے اپنے معاشرے کی تشکیل کرتے ہوئے غلامی کو لازم اور ضروری قرار دیا ہے۔ خود قرآنِ کریم میں غلام بنانے کے بارے میں ایک لفظ بھی موجود نہیں ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اسلام غلام بنانے کی ترغیب دیتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ اسلام میں غلام بنانے کی کوئی صورت نہیں، بلکہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کس صورت میں ہے۔

دنیا میں غلامی کی مختلف وجوہات ہیں، جن پر گفتگو بہت طویل ہو جائے گی، سات آٹھ طریقے تھے۔ غلام بنانے کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقے کی اسلام نے اجازت دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایسا دشمن جس کے ساتھ آپ حالتِ جنگ میں ہوں (بشرطیکہ ایک ایسی جنگ ہو جس میں تمام ابتدائی شرائط کو ملحوظ رکھا گیا ہو، جن میں پہلے انہیں تبلیغ کرنا بھی شامل ہے)، تو میدانِ جنگ میں جنگی قیدی کو آپ غلام بنا سکتے ہیں۔ البتہ قرآن میں اس کا کوئی نام نہیں لیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے: فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا. جب میدانِ جنگ میں تمہارا کافروں سے سامنا ہو (عربی زبان میں لقاء جنگ کا کنایہ ہے)۔ جب میدانِ جنگ میں کفار سے آمنا سامنا ہو اور انہوں نے تمہاری طرف اور تم نے اُن کی طرف تلواریں تانی ہوئی ہوں، فَضَرْبَ الرِّقَابِ. تو انہیں مردانہ وار مارو، پسپائی اختیار نہ کرو، حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ. یہاں تک کہ انہیں جنگ کا مزہ چکھا دو، اُن کے گھٹنے ٹکا دو۔ یہاں تمہارا عمل ایک دوسرے کام میں تبدیل ہو جائے گا، فَشُدُّوا الْوَثَاقَ، انہیں مضبوطی سے پکڑ لو اور باندھ دو، اسیر کر لو۔ اب اسیر بنانے کے بعد ان کے ساتھ کیا کرو؟ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۱)، جب انہیں قیدی بنا لو تو پھر تمہیں اختیار ہے، چاہو تو انہیں بغیر کسی عوض کے آزاد کر دو، کہ وہ اپنے معاشرے میں واپس لوٹ جائیں، اور چاہو تو ان کی آزادی کے عوض کوئی فدیہ وصول کر لو، مثلاً اگر تمہارا کوئی آدمی اُن کی قید میں ہو، تو اس سے تبادلہ کر لو، یا پیسے لے کر انہیں آزاد کر دو۔

قرآنِ کریم میں {اس بارے میں} اس سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن سنت میں دو چیزیں مزید

۱۔ سورۂ محمد ۴۷۔ آیت ۴

ہیں' ایک یہ کہ اگر اسیر کیا گیا شخص ایسا ہو جس کو زندہ چھوڑ دینا اسلام اور مسلمین کے لیے خطرناک ہے' تو اسے قتل کر دو' اور دوسرا یہ کہ اسے غلام بنالو۔ پس یہ چار چیزیں: یا تو احسان کرتے ہوئے اسے آزاد کر دینا' یا رقم لے کر یا قیدی کے تبادلے کے ذریعے فدیہ لینا' یا اسے قتل کر دینا اور یا غلام بنالینا' ولیٔ امر مسلمین کے اختیار میں ہیں' وہ ان چار میں سے جس کام میں مصلحت سمجھے اس پر عمل کرے۔ یعنی قرآن میں غلام بنانے کا ذکر نہیں' صرف سنت میں اس کا تذکرہ ملتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ یہ ایک دوسرے درجے کا امر ہے' نہ کہ درجۂ اوّل کا۔ پھر یہ کہ ولیٔ امر مسلمین کو یہ اختیار حاصل ہے کہ مصلحت کو ملحوظ رکھے۔ کیا مصلحت اسے یوں ہی آزاد کر دینے میں ہے' یا مصلحت یہ ہے کہ فدیہ وصول کرے' یا اسے قتل کر دے' یا غلام بنالے؟ اور اگر ولیٔ امر مسلمین کسی صورت مصلحت نہ سمجھے۔ مثلاً زمانے کے تقاضے اجازت نہ دیں' غلام نہ بنائے' تو غلام نہ بنانے کی صورت میں اس نے اسلام کے حکم کو معطل نہیں کیا ہے' بلکہ اس کا اجرا کیا ہے۔

اب یہاں ایک اور سوال ہے' اور وہ یہ کہ یہ جو اسلام نے سنت کے تحت قیدی کو غلام بنانے کی اجازت دی ہے' تو کیا یہ ''جو تم کرو گے وہ ہم کریں گے'' کی سی بات ہے؟ اس لیے کہ اُس زمانے میں قیدیوں کو غلام بنالینا معمول تھا۔ یعنی کیونکہ اُن لوگوں نے تمہارے اسیروں کو غلام بنایا ہے' اس لیے تم بھی اُن کے اسیروں کو غلام بنالو؟ یا نہیں' بلکہ یوں تھا کہ اگر وہ غلام نہ بھی بنائیں' تب بھی تم غلام بناؤ؟

بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اگر وہ غلام بنائیں' تو تم بھی غلام بناؤ۔

پس اگر دشمن ہمارے قیدیوں کو غلام نہ بنائے' تو کیا ہمیں اُس کے قیدیوں کو غلام بنانے کا حق ہے؟

اگر آج مسلمانوں اور کفار مثلاً اسرائیل کے درمیان جنگ چھڑ جائے' اور اسرائیل مسلمان قیدیوں کو غلام نہ بنائے' تو کیا مسلمان شرعاً اسرائیلی قیدیوں کو اپنا غلام بنا سکتے ہیں؟

اس مفروضے کے مطابق' نہیں {مسلمان اسرائیلی قیدیوں کو اپنا غلام نہیں بنا سکتے}۔ (اب ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ دنیا اجازت دیتی ہے یا نہیں)' یعنی ولیٔ امر کو یہ راہ اختیار کرنے کا

حق نہیں ہے' کیونکہ صرف اُس وقت انہیں غلام بنا سکتے ہیں' جب وہ بھی غلام بنائیں' جب وہ غلام نہیں بنا رہے' تو اسلام کہتا ہے کہ تم بھی غلام نہ بناؤ۔

پس اسلام نے غلامی کے لیے کوئی بساط نہیں بچھائی ہے' اور یہ نہیں کہا ہے کہ میں ہر حال میں غلامی کو لازم سمجھتا ہوں' اور اس بات پر اسے کوئی افسوس نہیں اور اس پر اسے کوئی پچھتاوا نہیں کہ ہائے! دنیا میں غلامی کیوں نہیں ہے؟!

جو چیز انسان کو مطلوب ہے وہ آزادی ہے' آزادی ہر صورت میں ہونی چاہیے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ کیونکہ آج کی دنیا میں غلامی نہیں پائی جاتی' اس لیے غلاموں کی آزادی کا مسئلہ بھی موجود نہیں' پس اس صورت میں بھی تو اسلامی احکام کا ایک حصہ عملاً منسوخ ہے۔ اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ منسوخ نہیں ہے' بلکہ اس کا موضوع ہی باقی نہیں رہا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اسلام نے آبِ قلیل اور آبِ کثیر دونوں کے احکام بیان کیے ہیں' اور مثلاً کہا ہے کہ اپنے ہاتھ پر آبِ قلیل کو دو مرتبہ اور آبِ کثیر کو ایک مرتبہ ڈالو۔ بعد میں نلکے لگ گئے اور آبِ جاری اس قدر زیادہ ہو گیا کہ اب آبِ قلیل کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لہٰذا یہ دیکھ کر کوئی کہے کہ اسلام کے احکام منسوخ ہو گئے ہیں۔ نہیں' اسلام کا یہ حکم منسوخ نہیں ہوا ہے۔ اسلام اس بات پر زور نہیں دیتا کہ لازماً آبِ قلیل موجود ہو' تاکہ آپ اُسکے ذریعے پاکیزگی حاصل کریں' بلکہ اسلام صرف یہ کہتا ہے کہ اگر آبِ قلیل موجود ہو' تو اس کا حکم یہ ہے۔ اسلام کی نظر میں تو بہتر یہ ہے کہ آبِ قلیل موجود ہی نہ ہو۔ اب اسکے معنی منسوخیت نہیں ہیں {بلکہ صرف موضوع باقی نہیں رہا ہے}۔

ہمیں کہیں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کے بارے میں اسلام نے حکم دیا ہو اور وقت اور زمانے کے تغیرات نے اس حکم کو تبدیل کر دیا ہو۔ یعنی وہ {حکم} زمانے کے حقیقی تغیرات سے ہم آہنگ نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ جناب زمانہ مسلسل تغیر پذیر ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام کے قوانین جزئی نوعیت کے ہیں' مثلاً بلدیہ سیب کے نرخ مقرر کرتی ہے کہ سیب بیس روپے کلو ہے' پھر دو ہفتے بعد تبدیل کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اب سیب پندرہ یا دس روپے کلو ہے۔ اسلام نے قوانین

اس طرح وضع نہیں کیے ہیں کہ مثلاً اشیا کے نرخ معین کیے ہوں یا ان کی قیمت کی توثیق کی ہو لوگوں کے لیے لباس کا کوئی خاص انداز لے کر آیا ہو لوگوں کے لیے سواری کا کوئی خاص انداز لے کر آیا ہو۔ اسلام نے زندگی کے متغیر مظاہر (phenomena) کے بارے میں کبھی کوئی حکم نہیں دیا' بلکہ وہ ناقابلِ تنسیخ کلی اور اساسی احکام لے کر آیا ہے جو زندگی کے تمام متغیر مظاہر کے ساتھ سازگار ہیں۔

چوتھا خطاب

اسلامی تعلیمات اور لامتناہی مقاصد

چوتھا خطاب

اسلامی تعلیمات اور لامتناہی مقاصد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُلِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ.... اَعُوۡذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

"مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَ لٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ."

بعض علمائے اسلام نے خاتم اور خاتمیت کی ایک تعریف بیان کی ہے' اس بارے میں وہ کہتے ہیں کہ: الخاتِمُ مَنۡ خَتَمَ المَراتِبَ بِاَسۡرِھا. خاتم' یعنی پیغمبر خاتم وہ پیغمبر ہے جس نے تمام مراتب طے کر لیے ہیں' اور اسکی نظر میں اور اسکے کام کے اعتبار سے اب کوئی ایسا مرحلہ باقی نہیں رہ گیا ہے جسے طے ہونا چاہیے تھا' یا جو طے ہونے سے رہ گیا ہو۔

خاتمیت کی اس تعریف میں صرف اس پہلو پر توجہ مرکوز نہیں ہے کہ اب اسکے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا' بلکہ اسکی وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اب کیوں کوئی اور صاحب شریعت پیغمبر نہیں آئے گا۔ عرض کیا گیا ہے کہ اب علم و عقل کی راہ سے نہیں (جو ایک علیحدہ راہ ہے اور خود انسان کے امکان میں ہے) جس کے ذریعے چیزوں کو دریافت کرنا انسان کی ذمے داری ہے' بلکہ نبوت کے اعتبار سے' یعنی وحی اور الہام کے ذریعے سے جو کچھ انسان کو جاننا چاہیے اس میں کوئی بیان کرنے والی بات باقی نہیں رہ گئی ہے۔ کوئی ایسی بات جس کی نشاندہی کی ضرورت ہو' اب باقی نہیں رہی ہے۔ کوئی قابلِ بیان بات' بیان کرنے سے رہ نہیں گئی ہے۔ جب اس حوالے سے تمام مراحل اختتام کو

پہنچ چکے ہیں' تو لازماً نبوت ختم ہو ہی جائے گی۔

یہاں ہم آپ کے لیے ایک مثال عرض کرتے ہیں: ہم فرض کرتے ہیں کہ کائنات میں موجود تمام معلومات' دنیا میں پائے جانے والے تمام علمی راز' چاہے اُن کا تعلق بے جان طبیعت سے ہو چاہے وہ جانداروں کی طبیعت سے تعلق رکھتے ہوں' انہیں انسان حاصل کر لے اور اسکے سامنے کوئی ایک مرحلہ بھی مجہول باقی نہ رہے۔ وہ عالم جس نے آخری مجہول کو کشف کر کے انسان کے اختیار میں دیا ہو' وہ خاتم العلما ہوگا' خاتم دانشمنداں ہوگا۔ اسکے بعد کوئی ایسا عالم پیدا نہیں ہوگا جس نے کوئی نئی بات دریافت کی ہو' اور ہر آنے والا عالم صرف گزشتہ علما کی دریافت کی ہوئی باتوں کا علم رکھے گا' خود سے کوئی نئی چیز دریافت نہیں کرے گا۔

البتہ یہ جو ہم نے عرض کیا ہے اس کا تعلق علم کے باب سے ہے' اور یہ ایک فرضیہ تھا اور ابھی انسان کی طرف سے بے جان طبیعت کے بارے میں ایسا کوئی دعویٰ کرنا انتہائی قبل از وقت ہوگا' چہ جائیکہ جاندار طبیعت کے بارے میں اور چہ جائیکہ پوری کائنات کے بارے میں۔

ابھی انسان کے لیے بہت جلد ہے کہ ایسا کوئی دعویٰ کرے' اور کہے کہ طبیعت میں کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی جس کا اسے علم نہ ہو' اور جسے اُس نے اپنی علمی طاقت سے کشف نہ کر لیا ہو۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بے جان طبیعت کے بارے میں انسان کم و بیش اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ بے جان طبیعت کے قوانین' یعنی جمادات کے قوانین کو اس نے دریافت کر لیا ہے۔ لیکن جاندار طبیعت کے بارے میں' نباتات اور حیوانات کے بارے میں کوئی اس قسم کا دعویٰ نہیں کرتا' بلکہ اب بھی انسان ابتدائی قدموں اور ابتدائی مراحل میں ہے۔ لیکن ہم نے یہ جو مثال عرض کی' مثال کے لیے کافی ہے۔ بعض انسانی علوم کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ جیسے کہ حساب کے بارے میں کہا جاتا ہے (صرف حساب کے بارے میں' ریاضیات کے بارے میں نہیں)۔ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے لیے (اس باب میں) جو کچھ سمجھنا ضروری تھا' وہ اس نے سمجھ لیا ہے' اب اس سے اوپر کچھ اور نہیں ہے۔

وحی سے تعلق رکھنے والے مسائل لامتناہی نہیں ہیں

وہ مسائل جنہیں انسان کو وحی اور الہام کے ذریعے سے کشف کرنا چاہیے' اور جنہیں اس طریقے سے بشر تک پہنچنا چاہیے' وہ لامتناہی نہیں ہیں' بلکہ محدود اور متناہی ہیں۔ جتنی انسان کی گنجائش اور اسکی استعداد ہے' جب اتنا بیان کیا جاچکا' تو بات ختم ہوگئی۔ اب اس خاتم پیغمبر کے بعد ایسے افراد آئیں جو بہت سے گزشتہ پیغمبروں کی حد اور درجے تک پہنچے ہوئے ہوں' یا اُن سے بالا تر ہوں' تب بھی وہ پیغمبر نہیں ہو سکتے۔ یعنی وہ کوئی تازہ پیغام نہیں لا سکتے' یعنی وہ جو پیغام بھی لائیں گے' وہ ایسا پیغام ہے جو ان سے پہلے لایا جاچکا ہے' بیان کیا جاچکا ہے' دریافت کیا جاچکا ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام' قطعاً اور یقیناً بہت سے انبیائے سلف سے افضل ہیں' آپ بہت سے غیبی رازوں اور معارف سے آشنا ہیں' جن سے حتیٰ بہت سے انبیائے سلف بھی آگاہ نہیں تھے۔ لیکن علی ابن ابی طالبؑ کے پاس خدا کی طرف سے کوئی ایسی نئی چیز نہیں ہے جسے ان سے پہلے کسی پیغمبر حتیٰ خاتم الانبیاؐ نے کشف نہ کیا ہو' انہیں اسکی خبر نہ ہو' انہوں نے اسکی خبر نہ دی ہو۔

یہ خاتمیت کے باب میں کی جانے والی ایک تعریف ہے' اور ایک صحیح تعریف ہے۔ اس تعریف میں معارفِ الٰہی بھی شامل ہیں اور یہ اخلاقی' اجتماعی اور عبادی قواعد و قوانین پر بھی محیط ہے۔

توحید و الٰہیات اور معارفِ ربوبی کے بھی مراتب و درجات ہیں۔ ایک ایسا شخص جو کہتا ہے کہ خدا ایک ہے' اور خدا کے ایک ہونے کے بارے میں اُس کا تصور ایسا ہی ہے جیسا اس کا تصور مثلاً سورج کے بارے میں ہے اور وہ کہتا ہے کہ سورج ایک ہے دو نہیں ہیں' ایسا شخص توحید کے ایک درجے پر ایمان رکھتا ہے' اور وہ شخص جو علی ابن ابی طالبؑ کی مانند کہتا ہے کہ: کُلُّ مُسَمّیً بِالْوَحْدَةِ غَیْرُهُ قَلیلٌ . (۱) وہ توحید کے ایک اور درجے کو بیان کرتا ہے' اور بہر حال یہ تمام مراتب و درجات کشف شدہ اور وہ ہیں جنہیں بیان کیا جاچکا ہے۔

انسان کی اخلاقی خصوصیات' یعنی انسان کے خود اپنے آپ سے تعلقات' اور انسان کی اپنی

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۶۵ {اسکے علاوہ جسے بھی واحد کہا جاتا ہے اسکی وحدت قلت ہے}

جبلتوں (instincts) کو منظم کرنے کی کیفیت' جس کا نام اخلاق ہے' وہ عالی ترین نظام جس کے تحت انسان کو اپنی جبلتوں کی تنظیم کرنی چاہیے' وہ بیان ہو چکا ہے۔ وہ اصول و روابط جو انسان کو اپنے معاشرے میں ملحوظ رکھنے چاہئیں' بیان ہو چکے ہیں۔ انسان کے کائنات کی دوسری موجودات سے روابط کے بارے میں جن باتوں کو کلی طور پر مردود سمجھنا چاہیے' وہ مردود کی حیثیت سے پہچان لی گئی ہیں۔ اب ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی جسے بیان کرنا وحی کی ذمے داری ہو' اور وحی پر لازم ہو کہ اسے لوگوں کے لیے بیان کرے۔ اب اسکے بعد عقل اور علم کی ذمے داری ہے۔

اس مقام پر ایک نکتہ ہے جسے واضح کیا جانا ضروری ہے۔

اسلامی تعلیمات کے زندہ رہنے کا راز

دین کے زندہ رہنے کا راز کیا ہے؟

اسلام ایک زندہ دین ہے اور تا قیامت زندہ رہ سکتا ہے' اس کا کیا سبب ہے؟

اس کا راز اور سبب یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کا ہر حصہ' ایسی تعلیمات پر مشتمل ہے جن کا کوئی جانشین اور نعم البدل نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ اسلام نے اپنی تعلیمات میں انسان کے لیے کسی صورت جزئی اور عارضی اہداف کا حصول نہیں چاہا ہے۔ انسان کے جزئی اور عارضی اہداف زمان و مکان سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ہر ایسی تحریک جو ایک جزئی ہدف سے وابستہ ہو' اور اسی جزئی ہدف کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا ہو' اس ہدف کے خاتمے کے بعد وہ تحریک بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر دنیا میں کوئی ایسی تحریک وجود میں آئے جس کا ہدف لامحدود ہو' اور انسان جتنا بھی آگے بڑھے اسے اپنا ہدف آگے ہی نظر آئے' نہ کہ اپنے پیچھے' تو ایسی تعلیم ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہے۔ ہم مثال عرض کرتے ہیں:

اگر آپ دنیا میں انسانوں کی جانب سے اٹھائی گئی تحریکوں کا جائزہ لیں' تو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تحریکیں ایک محدود زمان و مکان میں ایک زبردست شور و غل کے ساتھ اٹھتی ہیں' لیکن کچھ ہی مدت بعد ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔ اگر انہیں کوئی دوسرا ٹھنڈا نہ بھی کرے' تب بھی وہ خود بخود ہی ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ ہم بعض ایسی تحریکوں کی مثال پیش کرتے ہیں جو ہمارے زمانے میں تھیں یا اب بھی

باقی ہیں۔ دس پندرہ سال قبل ایران میں تیل کو قومی ملکیت میں لینے (nationalization) کے عنوان سے ایک تحریک اٹھی۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' اور اپنے زمانے میں ایک زندہ تحریک تھی' اس نے قوم کو ایک مقصد کے لیے متحرک کر دیا تھا۔ وہ مقصد کیا تھا؟ وہ کہتی تھی کہ تیل کی صنعت کو قومیانہ چاہیے۔ جب آپ عوام کی اکثریت اور شاید اسکے تمام ہی لوگوں کو دیکھتے تو دیکھتے کہ وہ اسی موضوع پر بات کر رہے ہیں' کہ ہاں جناب' تیل کو قومی ملکیت میں لینا چاہیے۔ زن و مرد' پیر و جواں' جاہل و عالم' سب کی زبان پر یہی بات تھی۔ لیکن عوام کے درمیان اس بنیاد پر اٹھنے والی تحریک' مقدس ہونے کے باوجود لوگوں کے درمیان دوام پیدا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کا مقصد ایک جزئی مقصد ہے۔ اگر کوئی قوم کسی ایسے مقصد کے لیے دس سال' پندرہ سال جدوجہد کرے' اور اپنا مقصد حاصل کر لے' تو تحریک خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اسکے بعد اسکی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ پھر اس مقصد کی جگہ لینے کے لیے ایک نیا مقصد سامنے لانا ضروری ہو جاتا ہے' تاکہ قوم میں حرکت و جنبش پیدا ہو۔ اور اگر قوم اس مقصد کے لیے دس سال' بیس سال' تیس سال زحمت اٹھائے اور دیکھے کہ نہیں' وہ اس تک نہیں پہنچ پا رہی' تو مایوسی چھا جاتی ہے' اور تحریک خود بخود دم توڑ دیتی ہے' زوال کا شکار ہو جاتی ہے' ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ جیسے ہمارے ایران میں ہوا۔

ممالک اسلامیہ کے ایک گوشے میں ''تحریک آزادی و استقلال کشمیر'' کے نام سے ایک تحریک ہے۔ لاکھوں افراد نے اپنے کاندھوں پر اس تحریک کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے' اسکے لیے سرگرم عمل ہیں' مشکلات جھیلتے ہیں' قید و بند قبول کرتے ہیں۔ شیخ عبداللہ کے نام سے ایک شخص ہے' جسے شیر کشمیر کہا جاتا ہے۔ اس شخص نے اس تحریک کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے' اکثر ہندوستان کی جیلوں میں رہتا ہے' کہا جاتا ہے کہ ابھی حال ہی میں رہا ہوا ہے۔ یہ تحریک ایک مقدس تحریک ہے' لیکن ایک ایسی تحریک ہے جو محدود زمان و مکان سے تعلق رکھتی ہے' یا آخرکار نتیجے تک پہنچے گی اور وہاں کے مسلمان آزادی اور خودمختاری حاصل کر لیں گے' یا پھر یہ کہ تیس چالیس سال بعد اُن کے ذہن میں آئے گا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں اور ہندوستانی قوم میں ضم ہو جائیں گے اور یوں

معاملہ اپنے اختتام کو پہنچے گا۔

اسلامی ممالک کے ایک اور گوشے میں تحریکِ آزادیٔ فلسطین کے نام سے ایک تحریک ہے۔ یہ بھی اسی طرح ہے۔ یہ عارضی اہداف و مقاصد کی حامل تحریکیں ہیں' جو مخصوص زمان و مکان سے وابستہ ہیں۔

اب اگر اسلام آتا اور اس قسم کی اسلامی تحریک کا حامل ہوتا' صرف ھُبَل' لات یا عُزیٰ جیسے بت کے خلاف جنگ کی صورت رکھتا اور پیغمبر فقط ان بتوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے تشریف لاتے اور مقصد صرف یہیں تک محدود ہوتا' تو لامحالہ فتحِ مکہ کے بعد بساط لپٹ جاتی' کیونکہ اس تحریک نے اپنا ہدف حاصل کرلیا ہوتا' اور کوئی تحریک جب اپنے ہدف اور نتیجے تک پہنچ جائے' تو خود بخود ماند پڑ جاتی ہے۔ لیکن اسلامی تحریک' توحیدی تحریک تھی۔ یہ توحیدی تحریک جب اُس عصر اور اُس زمان و مکان میں تھی جب لوگ لات و عُزیٰ و ھُبَل و مَنات اور ان جیسے بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے' تو اس تحریک کا مقصد ان (بتوں) سے جنگ تھا' لیکن کیونکہ اس تحریک کی بنیاد لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور لَا مَعْبُودَ اِلَّا اللّٰهُ تھی' لہٰذا یہ ھبل و لات و عُزیٰ تک محدود نہ تھی۔ خدا کے سوا کوئی چیز' کوئی شخص' کوئی ستارہ' کوئی سورج' کوئی چاند' کوئی انسان' حتیٰ کوئی دین' کوئی مسلک' کوئی ایسی چیز جس پر شئے کا اطلاق ہوتا ہو' انسان کا ہدف و مقصد اور معبود بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ قابلِ پرستش حقیقت صرف اور صرف خدا ہے' وہی خدا جس کی ذات کی کوئی انتہا نہیں' اور اسکی طرف انسان کا سفر نہ کبھی ختم ہوسکتا ہے اور نہ اس میں تھکن اور خستگی راہ پاسکتی ہے۔

قرآنِ کریم اپنا ہدف اس طرح بیان کرتا ہے: قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ. عرب میں ھبل' لات اور عُزیٰ تھے' لیکن عرب سے باہر تو یہ بت نہ تھے' یہودی اور نصرانی تھے' مجوسی تھے' یہ لوگ تو ھبل کی پوجا نہیں کیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم ان سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ. آؤ ہم سب ایک کلام اور ایک حقیقت کی جانب چلتے ہیں' ایک ایسی حقیقت جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں حیثیت کی مالک ہے' یعنی وہ نہ ہم سے مخصوص ہے اور نہ تم سے مخصوص

ہے' نہ ہم سے اختصاص رکھتی ہے اور نہ تم سے اس کا کوئی خصوصی تعلق ہے۔ ہم سب کو مل کر ایک ایسی حقیقت کی جانب چلنا چاہیے' جو نہ ہم سے اختصاص رکھتی ہے اور نہ تم سے' ہم سے اور تم سے مساوی نسبت رکھتی ہے۔ وہ کیا ہے؟ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ. خدا کے سوا کسی چیز کی پرستش نہ کریں' صرف اور صرف خدا کی پرستش کریں۔ خدا کے سوا جو کچھ ہے اسکے مقابل کورنش نہ بجالائیں' سر نہ جھکائیں۔ ہم سب بشر ہیں' سب انسان ہیں' ہر چیز کو انسان کے لیے خلق کیا گیا ہے' اور انسان کو خدا کے لیے {خلق کیا گیا ہے}' غیر خدا کے سامنے سر نہ جھکائیں' البتہ حکمِ خدا سے {یہ کیا جاسکتا ہے} وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا. (اور کسی کو خدا کا شریک قرار نہ دیں) وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ. (۱)۔ دوسرے یہ کہ کیونکہ ہم سب افرادِ بشر ہیں' لہٰذا ہم میں سے بعض افراد بعض دوسرے افراد کو اپنا رب اور اپنے اوپر صاحبِ اختیار قرار نہ دیں۔ تمام انسان مساوی ہیں۔ ہمیں اس خدا کی پرستش کرنی چاہیے جو سب کا خدا ہے' اور {اس حوالے سے} ہم میں سے ہر ایک' ایک دوسرے کی نسبت مساوی حیثیت کا مالک رہے۔

وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ. انسان کو قرآنِ مجید کا دیا ہوا یہ ہدف' کیا اُن اہداف میں سے ہوسکتا ہے جو کسی خاص زمان و مکان تک محدود ہوتے ہیں؟ آج بھی جبکہ اس آیت کو نازل ہوئے چودہ سو سال گزر رہے ہیں' یہ اسی طرح تر و تازہ ہے جیسی کہ چودہ سو سال پہلے تھی' اسی قدر نجات بخش ہے' جس طرح چودہ سو سال پہلے نجات بخش تھی' اسی قدر آج کے انسان کو اسکی ضرورت ہے' جس قدر چودہ سو سال قبل کے انسان کو اسکی ضرورت تھی۔ ایک جوان طالبِ علم جو یورپ گیا ہو' جس نے ہر طرح کا علم و دانش حاصل کیا ہو' وہ بھی اسے اپنی آئیڈیالوجی میں اپنا سرِ فہرست ہدف قرار دے سکتا اور اس پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ دینِ مقدسِ اسلام کی دوسری تمام تعلیمات بھی اسی طرح ہیں۔ آپ دینِ مقدس اسلام کی کسی بھی تعلیم پر انگلی رکھیے' آپ دیکھیں گے کہ وہ اسی طرح ہے۔

۱۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۶۴

اسلامی تعلیمات' جو مثلاً معاد اور معاد شناسی کے بارے میں ہیں' وہ بھی اسی طرح ہیں۔ وہ کہتا ہے: اے انسان! تو ایک ایسا موجود ہے کہ تیری حقیقت' تیری ہویت' تیری ذات اس قسم کی ہے کہ تو اپنے خدا کی طرف پلٹ کر جائے گا' وہ تمام اعمال جن کا تو اس دنیا میں مرتکب ہوتا ہے' وہ خود تیری ہی مانند! فانی ہیں: اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَ نَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَھُمْ وَ کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ. (۱) اس بات کا ذکر ایک عالمی علمی حقیقت کے طور پر کرتا ہے: وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی. (۲) اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. (۳) ہم سب اس خدا کی طرف سے ہیں اور ہمیں خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے' ہم جو قدم بھی اٹھاتے ہیں' {ہم پر} جو لمحہ بھی گزرتا ہے ہم خدا اور قیامت سے قریب ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی حقیقت نہیں جو کسی معین زمانے سے مخصوص ہو' یہ انسان کو اسکے اعمال اور نیتوں کی جانب متوجہ کرتی ہے' اسکی صفات و اخلاق کی جانب متوجہ کرتی ہے۔

اسلام غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یہ تعلیم اسلام کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ کیا انسان کے لیے کوئی ایسا دن آئے گا جس میں اسکے لیے غور و فکر نہ کرنا' غور و فکر کرنے سے بہتر ہوگا؟ اسلام علم کی طرف دعوت دیتا ہے: وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ. (۴) وہ کہتا ہے کہ کسی بھی موضوع اور مسئلے میں تمہارے فیصلہ کرنے کا معیار اور کسوٹی ظن و گمان اور پندار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اسی مقام پر خرافات کی جڑ کاٹ ڈالتا ہے۔ صرف اُس بات کو قبول کرو جس کا یقین حاصل کر چکے ہو' اور جو علمی لحاظ سے تمہارے لیے ثابت' مسلّم اور قطعی ہو' اور ہر وہ چیز جس کی بنیاد حدس و گمان ہو اور جس میں شاید اور غالباً پایا جائے اس پر کسی صورت بھروسا نہ کرو۔

۱۔ سورۂ یٰسین ۳۶۔ آیت ۱۲ {بے شک ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ان کے گزشتہ اعمال اور ان کے آثار کو لکھتے جاتے ہیں اور ہم نے ہر شئے کو ایک روشن امام میں جمع کر دیا ہے}

۲۔ سورۂ نجم ۵۳۔ آیت ۴۲ {اور بے شک سب کی آخری منزل پروردگار کی بارگاہ ہے}

۳۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۵۶ {ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی بارگاہ میں واپس جانے والے ہیں}

۴۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۳۶ {اور جس چیز کا تمہیں علم نہیں ہے اسکے پیچھے مت جانا}

اسلام کے اصولوں میں سے ہے کہ اُس نے کام اور زندگی کے میدان کو عمل اور عبادت کا میدان قرار دیا ہے' انسان کے لیے کام عبادت { کی حیثیت رکھتا} ہے اور بیکاری اسکے لیے گناہ ہے' بیکار پڑے رہنا اور سستی و کاہلی گناہ ہے' دوسروں کے سر پر (dependent) زندگی بسر کرنا گناہ ہے۔

یہ انسان کے لیے ایسے حقائق ہیں جو نہ صرف تا ابد منسوخ نہیں ہو سکتے' بلکہ کوئی دوسرا قانون آ کر ان کی جگہ بھی نہیں لے سکتا۔ اسی طرح اسلام کا باہمی تعاون کا حکم دینا وغیرہ جیسی چیزیں ہیں' کہ ہمارے خیال میں ان چیزوں کی توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کچھ ایسی مثالوں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں جو کبھی کبھی لوگوں کے لیے شبہ پیدا کر دیتی ہیں۔

اضافۂ آبادی

ایک اور مسئلہ اضافۂ آبادی کا مسئلہ ہے' جس پر یورپ میں خوب ہنگامہ مچا ہوا ہے' اور اسی کو بنیاد بنا کر وہ کہتے ہیں کہ بطورِ مطلق دین (یہ نہیں کہتے کہ کلیسا) انسانی زندگی کے قدموں کی زنجیر ہے' اور زمانے کے حالات اور تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بشریت گزشتہ ایک دو صدیوں سے اس مسئلے سے دوچار ہے۔ یہ لوگ ایک خاص حد سے زیادہ آبادی میں اضافے کو بشریت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں نے حساب لگایا ہے کہ اگر روئے زمین پر انسانی آبادی فلاں مقدار تک پہنچ جائے' تو انسانوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑے گا اور لوگ ایک دوسرے کو کھانے لگیں گے۔

البتہ یہ مسئلہ قدیم لوگوں کے سامنے ایک دوسری صورت سے ہوا کرتا تھا۔ قدیم فلاسفہ جنہوں نے خیر اور شر کے مسئلے پر بحث کی ہے' وہ موت کو انسان کے لیے خیر شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ موت فرد کے لیے شر ہونے کے باوجود نوعِ بشر کے لیے خیر ہے۔ کیونکہ اگر روئے زمین کا کوئی ایک فرد بھی موت سے ہمکنار نہ ہوتا' چاہے افرادِ بشر افزائشِ نسل کریں یا نہ کریں؟ اگر وہ افزائشِ نسل نہ کریں تو انہوں نے آئندہ آنے والی نسلوں کا راستہ روکا ہے' اور اگر افزائشِ نسل کریں' اور {پیدا ہونے والے انسانوں میں سے} کوئی نہ مرے' تو چند صدیوں بعد اگر افرادِ بشر زمین پر کھڑا ہونا چاہیں گے' تو ان سب کے لیے { کھڑے ہونے کی} جگہ بھی نہ رہے گی چہ

جائیگا۔ وہ زمین سے کوئی اور استفادہ کر سکیں۔ پس گزشتہ نسلوں کو زمین سے رخصت ہو جانا چاہیے تا کہ آئندہ آنے والے انسانوں کی بقا اور زندگی بسر کرنے کے لیے حالات سازگار رہیں اور کائنات آگے کی جانب رواں دواں رہے۔

ان لوگوں نے یہ بات ایک اعتبار سے کی ہے جبکہ علمائے اقتصاد نے اس بات کو ایک دوسرے اعتبار سے کہا ہے۔ یورپی ممالک میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اُن کی آج جو آبادی ہے وہ اُن کی آبادی کی آخری حد ہے۔ اگر چہ کہا جاتا ہے کہ سو سال پہلے سے اب تک بعض یورپی ممالک کی آبادی تین گنا ہو چکی ہے' لیکن انہوں نے ان حالیہ بیس تیس برسوں میں آبادی کو ایک حد میں کنٹرول کیا ہے۔

آبادی کو اس طرح ایک حد میں کنٹرول کرنا' صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب بچوں کی پیدائش کو روکا جائے' کیونکہ علم طب نے ترقی کی ہے' اور وہ کثیر اموات آج واقع نہیں ہوتیں جن کا {گزشتہ ادوار میں} بہت سے امراض کی وجہ سے انسانیت کو سامنا کرنا پڑتا تھا' اور جن کی وجہ سے آبادی میں کمی واقع ہوتی تھی۔ اگر علم طب اسی طرح ترقی کرتا رہے' اور افراد بشر افزائش نسل میں مصروف رہیں' اور ہر گھر میں سات' آٹھ اور دس تک بچے پیدا ہوں اور اسی نسبت سے آبادی میں اضافہ ہو' تو صورتحال عجیب ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ تجویز کرتے ہیں کہ افزائش نسل کا سلسلہ روکا جانا چاہیے' اور بہت سے گھرانوں کو جبراً اس بات کا پابند بنانا چاہیے کہ وہ دو یا تین سے زیادہ بچے پیدا نہیں کریں گے۔

یہ ایک نیا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ صرف ہمارے زمانے میں سامنے آیا ہے' گزشتہ زمانے میں درپیش نہ تھا' کیونکہ سابقہ ادوار میں انسان اس صورتحال تک پہنچا ہی نہ تھا' اور دوسرے یہ کہ سابقہ ادوار میں آبادی میں اضافہ کوئی خطرہ ہی نہ تھا' کیونکہ قدرتی آفات کے نتیجے میں ہونے والی اموات خود بخود آبادی کو کم کر دیا کرتی تھیں' لیکن آج ایسا نہیں ہے۔

یہاں کلیسا (church) مداخلت کرتا ہے' اور کہتا ہے کہ اس عمل میں انسان کی دخل اندازی' خدا کے کام میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ لوگوں کا مرنا جینا' اُن کو موت دینا اور

انہیں پیدا کرنا خدا کا کام ہے' اور کسی کو حق نہیں کہ وہ خدا کے کام میں مداخلت کرے' کسی کو حق نہیں کہ مثلاً وہ مانع حمل گولیاں دے کر افزائش نسل کا راستہ روکے۔ کلیسا' کسی بھی ذریعے سے افزائش نسل روکنے کا مخالف ہے' اور اسے ایک گناہِ عظیم سمجھتا ہے۔

اس مقام پر لوگ کہتے ہیں کہ دینی احکام اور انسان کی معاشرتی زندگی کی ضروریات کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے' اور اسی مقام پر کبھی کبھی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کوئی بھی قانون' چاہے وہ آسمانی قانون ہی کیوں نہ ہو' اسے زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہو جانا چاہیے' اور بسا اوقات اس بات کو علم اور دین کے درمیان جنگ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

لیکن ہم مسلمانوں کی نظر میں یہ مسئلہ بنیادی طور پر درپیش ہی نہیں ہے۔ یعنی اسلام نے بنیادی طور پر اس قسم کا کوئی حکم دیا ہی نہیں ہے' اور اسلام کی نظر میں اس فکر کی بنیاد ہی غلط ہے۔

خدا کا کام ہونے سے کیا مراد ہے؟

دنیا کی ہر چیز خدا کا کام ہے اور ہم بھی خدا کے بندے ہیں۔ کیا زمین پر اُگنے والی گھاس پھوس خدا کے اذن اور اُسکی اجازت سے نہیں اُگتے؟ اگر آپ بالفرض ایک کسان ہیں اور اس سال زمین کے ایک حصے پر کاشت کرتے ہیں' اور دوسرے سال دوسرے حصے پر' اس سال گندم اور دوسرے سال جو کاشت کرتے ہیں' اور اگلے سال چقندر' تو کیا اس سال اس زمین پر کاشت کر کے اور اگلے سال اُس زمین پر کاشت کر کے اور بیج کے انتخاب میں بھی اپنی پسند سے کام لے کے آپ نے خدا کے کام میں مداخلت کی ہے؟

خدا کا کام یہ ہے کہ اُس نے یہ اس قدر عظیم کائنات خلق کی ہے' اور اسے اپنے محکم اور لازوال قوانین کے ذریعے رواں دواں کیا ہے۔ محال ہے کہ انسان خدا کے کام میں مداخلت کر سکے' یعنی وہ کائنات کا خالق اور اُسے چلانے والا بن جائے۔ انسان' اُسکی فکر' ارادہ' ذہانت اور جدت سب کا سب کائنات اور نظامِ الٰہی کا ایک جز ہے۔ انسان جو کام بھی کرتا ہے' {اسکے ذریعے} دراصل قضا و قدرِ الٰہی کا اجرا کرتا ہے۔ کائنات اور اسکے قوانین' سب مساوی طور پر خدا کی مخلوق ہیں' ہم بھی خدا کے بندے ہیں' ہمیں اور ہمارے عزم و ارادے کو' ہماری قدرت و طاقت کو' ہماری

ہر چیز کو خدا نے خلق کیا ہے' ہمارا ہاتھ خدا ہی کا ہاتھ ہے۔

خدا کے کام میں مداخلت کا کوئی مفہوم ہے ہی نہیں۔ یعنی ایسا کام دنیا میں واقع ہی نہیں ہوتا جو قضا و قدرِ الٰہی کے برخلاف ہو' جو خدا کے علمِ ازلی کے برخلاف ہو۔ یہ اصولی نقطۂ نظر سے ہے۔ جہاں تک بات رہی فقہی نقطۂ نظر کی' تو فقہا کہتے ہیں کہ اگر رحم میں نطفہ قرار پا جائے' تو اسے سقط کرنے میں اشکال ہے' لیکن جب تک وہ قرار نہ پایا ہو' اور ابھی انسانی جنین وجود میں نہیں آیا ہو' تو (اسے ضائع کرنے میں) کوئی مضائقہ نہیں۔ انسانی جنین' مرد اور عورت کے تولیدی خلیوں (ova & sperm) کے باہمی ملاپ سے وجود میں آتی ہے۔ یہ انسان کے وجود کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے جبکہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں' انسان کا پہلا مرحلہ وجود میں نہیں آیا ہوتا۔ صرف مرد یا صرف عورت کا نطفہ علیحدہ علیحدہ انسان کے وجود کا بیج نہیں بنتا۔ جب تک انسان کا بیج وجود میں نہ لائے ہوں حمل کے روکنے یا نہ روکنے کا اختیار اُن کے ہاتھ میں ہے۔ کیونکہ یہ انسان کشی شمار نہیں ہوگا۔ ایک اسکول کی طرح کہ جس میں {طالب علم کا} نام لکھنے سے پہلے تک کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس جگہ نہیں' لیکن جب نام لکھ لیں' تو پھر طالب علم کا نام خارج کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

آبادی میں اضافہ آج کی دنیا کو درپیش ایک نیا مسئلہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آبادی میں اضافے کا موضوع اور اسکی روک تھام کی ضرورت تمام ممالک پر صادق آتی ہے۔ بلکہ بعض ممالک آبادی کی کمی سے دوچار ہیں۔ اس حوالے سے جو پروپیگنڈے کیے جا رہے ہیں اکثر اُن کی بنیاد استعماری ہے۔ یورپی ممالک اپنی آبادی کی انتہائی حد تک پہنچ چکے ہیں' اور کیونکہ وہ ایشیائی اور افریقی ممالک کے وسائل (resources) سے استفادہ کرتے ہیں' اس لیے وہ ایشیا اور افریقہ کی آبادی میں کمی کے طرفدار ہیں' تاکہ بہتر طریقے سے اُن سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ وہ لوگ اس بات سے وحشت زدہ ہیں کہ کہیں ایشیائی اور افریقی ممالک کی آبادی ان کی مقرر کردہ حد تک نہ پہنچ جائے اور یوں اسکے نتیجے میں وہ ان ممالک سے لائی جانے والی نعمتوں سے محروم ہو جائیں۔ ذرائع ابلاغ آبادی میں اضافے کے خلاف بھرپور پروپیگنڈے میں مصروف ہیں' لیکن

آپ اس بات کی جانب توجہ رکھیے کہ آبادی میں اضافے کا مسئلہ' جسے ان لوگوں نے ''آبادی کا بم'' کا نام دے رکھا ہے (اور اس بارے میں اس قدر پروپیگنڈا کیا ہے کہ لوگوں میں بچوں سے ایک قسم کی نفرت کا احساس پیدا کر دیا ہے) وہ ہمارے ممالک پر صادق نہیں آتا۔ یعنی اسلامی ممالک ابھی تک آبادی کی انتہائی حد تک نہیں پہنچے ہیں۔ یہ ایک استعماری فریب ہے جس سے مغرب استفادہ کر رہا ہے۔ خود ان کی سرزمینوں کے لحاظ سے وہاں بسنے والی آبادی کافی مقدار میں ہے' لیکن وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ہمارے یہاں پروپیگنڈا کرتے ہیں اور اسلامی ممالک میں بڑھتی ہوئی آبادی کی طرف سے انتہائی وحشت کا اظہار کرتے ہیں' کیونکہ اس طرح ہم اپنی نعمتوں کو خود ہی استعمال کرنے لگیں گے۔ ایران' ترکی' افغانستان اور عراق جیسے ممالک میں سے ہر ایک اس قدر صلاحیت رکھتا ہے کہ اپنی آبادی سے کئی گنا زیادہ' شاید دس گنا زیادہ آبادی کو روٹی فراہم کر سکے۔ عراق کے بارے میں' جس کی آبادی شاید پانچ چھ ملین سے زیادہ نہ ہو' میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ یہ ملک ستر ملین افراد کو روٹی فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عراق کے لیے ابھی سے یہ کہنا بہت جلد بازی ہوگی کہ ہماری آبادی زیادہ ہے اور ہمیں اپنی آبادی اور اپنے یہاں بچوں کی پیدائش کو کنٹرول کرنا چاہیے۔ ہاں' عراق میں آبادی پر کنٹرول یورپ کے مفاد میں ہے۔ کیونکہ اس طرح عراق کو حاصل نعمتیں وہاں سے نکل کر اہلِ یورپ کے پیٹ میں جائیں گی' اس لیے کہ عراق میں انہیں استعمال کرنے والوں کی تعداد کم ہوگی۔ خود ہمارے ایران کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ایران کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں ساٹھ ملین آبادی کو روٹی فراہم کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے' جبکہ اس وقت یہاں کی آبادی زیادہ سے زیادہ پچیس ملین ہے۔

اضافۂ آبادی کے بارے میں ایک اور نکتہ ہے' اور وہ یہ کہ بشریت کی بھلائی اور بہتری کے نقطۂ نظر سے اس مسئلے کی کیا حیثیت ہے؟ یہ ایک ضرورت ہے لیکن بشریت کے لیے ہزاروں عوارض اور پیچیدگیوں کا حامل ہے۔ الکسیس کارل (Alexis Carrel) نے اپنی کتاب ''انسان موجودِ ناشناختہ'' (Man The Unknown) میں اس عمل کے عوارض اور مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''پیدائش پر کنٹرول کا مسئلہ جس انداز سے آج پیش نظر ہے

'وہ بشریت کو ختم کر کے رکھ دے گا۔'' یہ دانشمند انسان ایک عجیب بات کرتا ہے' کہتا ہے: ''یہ مسئلہ' نسلِ انسانی کا مکمل طور پر خاتمہ کر دے گا کیونکہ گزشتہ زمانے میں لوگ بچوں کی پیدائش میں آزاد تھے' اسی لیے بہت زیادہ بچے پیدا ہوتے تھے' لیکن علمی اور مالی وسائل ان سب کو باقی رہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے' چاہتے نہ چاہتے ہوئے ان میں سے اکثر بچے مر جاتے تھے' اور کم ہی باقی بچتے تھے۔''

وہی بات جو آپ کہتے ہیں' اگر اچھی طرح غور و فکر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ قانونِ تنازع بقا اور انتخابِ اصلح {بہترین کا انتخاب} کی رو سے طاقتور لوگ باقی رہ جاتے ہیں اور اُن میں سے ضعیف و ناتواں افراد جن میں زندہ رہنے کی طاقت نہیں ہوتی ختم ہو جاتے ہیں۔ دیہاتی افراد کے قوی اور مضبوط ہونے کا ایک راز یہ ہے کہ وہاں انتخابِ اصلح عمل میں آتا ہے اور صرف منتخب لوگ ہی زندہ بچتے ہیں۔ بے چارے دیہاتی افراد جن کے پاس دوا' ڈاکٹر اور اسپتال نہیں ہوتے' وہ خود سے' فقط اپنی فطری قوت سے مرض کا مقابلہ کرتے ہیں' سو میں سے اسّی بچوں کو بیماریاں اچک لے جاتی ہیں' لیکن باقی بچ رہنے والے بیس بچے حیرت انگیز طور پر سخت جان ہوتے ہیں۔ وہاں جو بچے باقی بچ جاتے ہیں وہ انتہائی مضبوط ہوتے ہیں' اسی وجہ سے باقی رہ جاتے ہیں۔

علمِ طب نے آ کر بیماریوں کا سدباب کیا ہے' اگر کوئی ضعیف اور ناتواں بچہ دنیا میں آتا ہے' ایسا بچہ اگر گزشتہ دور میں ہوتا' تو زندہ نہ بچتا' مر جاتا' کبھی کبھی تو پانچ یا سات ماہ ہی میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے' ایسے میں اسے فوراً ایک مخصوص مشین پر لے جاتے ہیں' اُسے مرنے سے بچاتے ہیں' اور رفتہ رفتہ خاص دواؤں اور غذاؤں کے ذریعے سے اسکی نگہداشت کرتے ہیں۔ وہ بچ جاتا ہے اور بڑا ہو جاتا ہے' اسکول بھی جانے لگتا ہے۔ البتہ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جسے دواؤں کے زور پر زندہ رکھا گیا ہوتا ہے' اور کیونکہ ماں باپ زیادہ بچے پیدا کرنا نہیں چاہتے' اس لیے آئندہ بچوں کی پیدائش کی روک تھام کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ بعد میں آنے والی نسل' زندہ بچ جانے والی ایک کمزور و ناتواں نسل ہوگی۔ اب اس شخص سے وجود میں آنے والی

نسل کا کیا حال ہوگا۔

اسلام نفسانی خواہشات کا مخالف ہے زمانے کے ضروری تقاضوں کا نہیں

ہماری مراد یہ ہے کہ اسلام نے کسی صورت انسان کو کوئی ایسی تعلیم نہیں دی ہے کہ وہ زمانے میں پیش آنے والے ضروری تقاضوں سے برسرِ پیکار ہو جائے' یعنی انسان کی اجتماعی اور اقتصادی ضروریات سے بھڑ جائے۔ اکثر افراد اپنے اندر معاشرتی ضروریات کے مقابل کچھ خواہشات پیدا کر لیتے ہیں' اور اسکے بعد خیال کرنے لگتے ہیں کہ ان خواہشات کا شمار بھی زمانے کے تقاضوں میں ہوتا ہے۔ اسلام نے ان خواہشات کے خلاف جنگ کی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم اسلام کے ساتھ رہے' تو زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکیں گے۔

مثلاً زمانہ آگے بڑھ گیا ہے' اس نے لکھنے کے ذرائع تبدیل کر دیے ہیں۔ پہلے زمانے میں قلم اور قلمدان ہوتا تھا' اور جو کوئی ایک سطر بھی لکھنا چاہتا' اسکے لیے ضروری ہوتا تھا کہ وہ انہی چیزوں کو استعمال کرتے ہوئے لکھے۔ لیکن اب رفتہ رفتہ ٹائپ رائٹر اور پرنٹنگ مشین آ گئی ہے۔ {قدیم زمانے میں لوگ} جب ایک کتاب کے سو نسخے شائع کرنا چاہتے تھے' تو یہ انتہائی مشکل کام ہوا کرتا تھا' لیکن اب جدید وسائل کے ذریعے چند ہی گھنٹوں میں پانچ ہزار نسخے طبع کر لیتے ہیں۔ ان چیزوں میں زمانہ آگے بڑھ گیا ہے' اور اگر کوئی زمانے کی اس ترقی سے لڑنا چاہتا ہے' تو اسے شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میں اپنی تحریروں کو انہی قدیم وسائل کے ذریعے اور خطی نسخوں کی صورت میں شائع کرنا چاہتا ہوں' میں خود قلم دوات استعمال کر کے لکھوں گا اور پیسے دے کر چند نسخے دوسروں سے بھی لکھواؤں گا۔ ایسی حالت میں آپ کو مطمئن رہنا چاہیے کہ آپ کا دشمن اور آپ کا حریف آپ سے کوسوں آگے ہے۔ یہ ایک بالکل سیدھی سی بات ہے۔ لیکن اب اسی دوران جبکہ طباعت جو کہ ایک معاشرتی ضرورت ہے' اسکے لیے جدید وسائل پیدا ہو جائیں' اور ایک خواہشات کا پجاری اور نادان گروہ ان وسائل سے غلط فائدہ اٹھائے اور مخربِ اخلاق تصاویر اور گمراہ کن مقالات شائع کرے' تو یہ چیزیں جو براہِ راست نفسانی خواہشات کی پیداوار ہیں' کیا انہیں سائنس' ترقی اور زمانے کے ضروری تقاضوں کے زُمرے میں

ڈال کر قبول کر لینا چاہیے؟!

علمی اور فنی ترقیوں کے پہلو بہ پہلو ایک ہوس باز گروہ کی کارستانیوں کے نتیجے میں جسم اور روح کے لیے مخرب اور محنت و مشقت' تقویٰ و پاکدامنی اور سکون و اطمینان کی دشمن بعض غلیظ اور گندی عادات نے بھی جنم لیا ہے۔ مثلاً خواتین کا ناخنوں کو چیتے {کے ناخنوں} کی طرح بڑھا لینا' یا گلی کوچوں' عمومی محفلوں اور دفتروں کارخانوں میں منی اسکرٹ اور شارٹ اسکرٹ پہننا' اسی طرح خواتین میں ناخنوں پر نیل پالش لگانے اور بالوں کا گنبد بنانے کا رواج ہو گیا ہے۔ اب ایسی صورت میں کوئی آئے اور کہے کہ اگر میں اپنے ناخنوں پر نیل پالش لگانا چاہوں' تو میرے وضو کا کیا ہوگا؟ اور کیونکہ زمانے کا تقاضا یہ ہے کہ میرے ناخنوں پر ایک ملی میٹر نیل پالش ہو' اور اسلام کہتا ہے کہ وضو کرتے وقت بدن پر {پانی پہنچنے میں حائل} کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے' لہٰذا اسلام زمانے کے تقاضوں کا مخالف ہے۔ اسلام سر پر مسح کرنے کو کہتا ہے' اور تم جو سر کے پچھلے حصے سے اٹھا کر بالوں کو سر پر لائی ہو یا {بازار سے} خرید کر جو اضافی بال تم نے اپنے سر پر لگائے ہوئے ہیں' اُن پر مسح نہیں کر سکتیں' {اب کہو کہ} پس اسلام زمانے کے تقاضوں کا مخالف ہے؟ آج فیشن ہو گیا ہے کہ مثلاً مرد اجنبی عورتوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں' اور اسلام اس کا مخالف ہے' پس اسلام زمانے کے تقاضوں کا مخالف ہے؟

جواب یہ ہے کہ آپ نے زمانے کی اُن ترقیوں میں' جن سے ہم آہنگ ہونا بقا' عزت اور سعادت کا موجب ہے اور زمانے کے اُن انحرافات میں جن سے ہم آہنگ ہونے کا نتیجہ صرف اور صرف تباہی ہے' کوئی فرق نہیں رکھا ہے۔ اگر آپ تمیز اور تشخیص کے لیے کوئی معیار چاہتے ہیں' تو یہ دیکھئے کہ وہ کیا چیزیں ہیں جن کے ساتھ اگر آپ ہم آہنگ نہ ہوئے تو واقعاً معاشرے سے پیچھے رہ جائیں گے' اور وہ کیا چیزیں ہیں کہ اگر اُن سے ہم آہنگ نہ ہوئے' تو نہ صرف پیچھے نہیں رہیں گے بلکہ آگے بڑھ جائیں گے۔

اگر کوئی بجلی' لاؤڈ اسپیکر' ٹیپ ریکارڈر' پرنٹنگ مشین' گاڑی اور ہوائی جہاز سے استفادہ نہ کرے' تو وہ واقعاً زندگی میں پیچھے رہ جائے گا' لیکن اگر دنیا میں کوئی ایسا آدمی ہو جس نے اپنی

زندگی میں ایک مرتبہ بھی رقص نہ کیا ہو' ایک مرتبہ بھی ناخنوں پر نیل پالش نہ لگائی ہو' ایک مرتبہ بھی شراب نہ پی ہو اور بدمست نہ ہوا ہو' ایک مرتبہ بھی پوکر نہ کھیلا ہو' جیسے آج کی انسانیت کے بڑے لوگوں جیسے پاسٹر (Pasteur) نے شاید اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بھی رقص نہ کیا ہو (وہ نہ صرف زندگی میں پیچھے نہیں رہا ہے' بلکہ آگے بڑھا ہے) کیا پاسٹر رقص کرنے کی وجہ سے پاسٹر بنا ہے؟ کیا آئن اسٹائن کے آئن اسٹائن بننے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے رقص کیا تھا' یا بدمست ہو کر غل غپاڑا کیا تھا؟ نہیں' (ایسا نہیں ہے)

اگر کوئی دنیا میں اسلام کے احکام کے مطابق عالم ہو' مفکر ہو' متقی ہو' پاک دامن ہو' راست گو ہو' نماز گزار ہو' روزہ رکھتا ہو' حج کرتا ہو' خمس وزکات ادا کرتا ہو' لیکن اپنی زندگی میں اُن {فضول} چیزوں سے دور ہو' تو کیا ایسا شخص دنیا کے صفِ اوّل کے انسانوں میں شامل نہیں ہو سکتا؟ یقیناً ہو سکتا ہے۔ پس یہ {چیزیں} زمانے کے تقاضے نہیں ہیں' بلکہ ہوا و ہوس میں ڈوبے ہوئے کچھ لوگوں کی نفسانی خواہشات کے تقاضے ہیں۔ جہاں کہیں آپ کو نظر آئے کہ اسلام منع کر رہا ہے' بقولِ سرخ بتی (red light) دکھا رہا ہے' وہاں یقیناً وہ زمانے کے تقاضوں کے سامنے رکاوٹ نہیں ہے' بلکہ خواہشاتِ نفسانی کے سامنے رکاوٹ ہے' اور یہ بیچارے ان دونوں باتوں کے درمیان تمیز نہیں کر سکے ہیں۔

پانچواں خطاب

جبرِ تاریخ اور اسلام کی جاویدانی

پانچواں خطاب

جبرِ تاریخ اور اسلام کی جاویدانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.... اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ."(۱)

ہم گزشتہ شبوں میں گفتگو کو جس ترتیب سے لے کر چل رہے تھے اُس کے مطابق آج رات ہم چاہتے تھے کہ خاتمیت کے ساتھ تعلق کے پہلو سے اجتہاد کے مسئلے پر کچھ نکات عرض کریں، لیکن ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ اجتہاد کے مسئلے اور زمانۂ خاتمیہ میں علما پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن پر گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے آج رات ایک اور نکتے پر گفتگو کر کے اسے ختم کر دیں، اس کے بعد اگر انشاءاللہ وقت اور موقع رہا تو اجتہاد کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔

آج رات ہماری گفتگو ایک ایسے نکتے کے بارے میں ہے جو آج {کی دنیا میں} بہت زیادہ مشہور ہے، اور اس نے تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان اس قدر اہمیت اور قدرت حاصل کر لی ہے کہ جوں ہی انسان اس کا نام لیتا ہے سامنے والا اسکے مقابل سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ آپ نے لازماً یہ جملہ بارہا سنا ہوگا کہ کہتے ہیں: "جبرِ تاریخ ہے، جبرِ زمان ہے"۔

اگر کوئی حادثہ پیش آتا ہے اور لوگ اس حادثے کے مقابل اپنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا عذر

۱۔ سورۂ حجر ۱۵۔ آیت ۹

پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس حادثے کو حتمی ناقابلِ اجتناب اور ناقابلِ مزاحمت قرار دینا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جبرِ تاریخ ہے اس کے مقابل کیا کیا جا سکتا ہے؟!

ہمارے زمانے میں 'جبرِ تاریخ' کا لفظ لوگوں کی نفسیات پر وہی کام کرتا ہے جو کچھ عرصہ پہلے تک ''قضاوقدر'' اور ''قسمت'' کے الفاظ کیا کرتے تھے۔ یعنی ایک فرد جب اپنے آپ کو کسی حادثے کے مقابل عاجز و ناتواں اور بے بس ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اس کے سامنے سر جھکا دینے کی کوئی قطعی دلیل پیش کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ: جناب! یہ قضائے الٰہی ہے 'تقدیر ہے' کیا تقدیر اور قسمت کے لکھے کے ساتھ کچھ کیا جا سکتا ہے؟!

در کفِ شیرِ نرِ خونخوارہ ای — غیرِ تسلیم و رضا کو چارہ ای (۱)

رضا بہ دادہ بدہ و ز جبین گرہ بگشای — کہ بر من و تو در اختیار نگشادند

گلیم بخت کسی را کہ بافتند سیاہ — بہ آب زمزم و کوثر سفید نتوان کرد (۲)

اس جیسی اور دوسری باتیں کثرت سے ہمارے ادب میں پائی جاتی ہیں۔ البتہ یہ بات عرض کرتے چلیں کہ: ''قضاوقدر'' اور ''جبرِ تاریخ'' دونوں ہی الفاظ کا ایک صحیح اور درست مفہوم بھی ہے 'ایسا نہیں ہے کہ یہ درست نہ ہوں۔ قضاوقدر ایک صحیح بات ہے 'قسمت ایک درست بات ہے' جبرِ تاریخ بھی ایک درست بات ہے 'لیکن اُس مفہوم میں نہیں جو عام طور پر عامۃ الناس ان الفاظ سے اخذ کرتے ہیں۔ عامۃ الناس ان دو الفاظ سے جو مفہوم اخذ کرتے ہیں 'وہ ایک غلط مفہوم ہے۔ وہ اشعار جو ہم نے پڑھے 'اُن سے ہمارا مقصد اُن شعرا پر اعتراض کرنا نہیں تھا جنہوں نے یہ اشعار کہے ہیں 'کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ان مفاہیم کو ایک بلند ترین سطح پر درک کیا ہوا ہے۔ {بلکہ} ہمارے مخاطب وہ افراد ہیں جو ان اشعار 'جملوں اور کلمات سے سوءِ استفادہ کرتے ہیں 'اور ان کا ایک غلط مفہوم لیتے ہیں۔

۱۔ خونخوار شیرِ نر کے ہاتھ چڑھ جانے کی صورت میں تسلیم و رضا کے سوا کیا چارہ ہے۔

۲۔ جو کچھ نصیب میں لکھ دیا گیا ہے اس پر راضی رہو اور پیشانی پر بل نہ ڈالو اس لیے کہ مجھے اور تمہیں اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ جس کی قسمت کی چادر سیاہ بنائی گئی ہو اسے آبِ زمزم و کوثر سے بھی سفید نہیں کیا جا سکتا۔

فی الحال ہم قضاوقدر اور قسمت کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ ہم نے ''انسان وسرنوشت'' (۱) نامی اپنی کتاب میں اس موضوع پر ایک حد تک گفتگو کی ہے۔

خاتمیت اور جبرِ تاریخ

ہماری مراد یہ ہے کہ ''جبرِ تاریخ'' کا لفظ جدت پسند طبقے کے یہاں وہی کردار ادا کرتا ہے جو ''قضاوقدر'' اور ''قسمت'' کے الفاظ عوام اور قدامت پرست لوگوں کے یہاں کرتے ہیں۔

اب ہم اس جبرِ تاریخ کے بارے میں مختصری گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جبرِ تاریخ کا یہ مسئلہ اسکے اُس مفہوم میں جس کا استعمال ہمارے یہاں کے جدت پسند کرتے ہیں خاتمیت کے مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے ہم اسکے اس ربط اور تعلق کے متعلق عرض کریں گے اور اسکے بعد جبرِ تاریخ پر گفتگو کریں گے۔

اس کا ربط اور تعلق اس طرح ہے کہ بنیادی طور پر خاتمیت کی اساس دین کی ہمیشگی اور جاویدانی پر قائم ہے۔ ہم جو خاتمیت کے قائل ہیں، ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اوّلاً ہمیشہ لوگوں کے درمیان خدا نے ایک دین رکھا ہے۔ خود دین ایک جاویداں حقیقت ہے اور افرادِ بشر کے درمیان منسوخ نہیں ہوگا۔ ثانیاً یہ کہ وہ دین جسے ہمیشہ انسانی معاشرے میں باقی رہنا چاہیے اور باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ دین اسلام ہے۔ اور دنیا کی وہ واحد کتاب جو افرادِ بشر کے درمیان ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے، نہ مرے گی، نہ منسوخ ہوگی اور جو ہمیشہ تر و تازہ باقی رہے گی، وہ قرآن ہے: ''اِنَّانَحْنُ نَزَّلْنَاالذِّکْرَوَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ.''

مصطفیٰ را وعدہ داد الطافِ حق گر بمیری تو نمیر دایں سبق (۲)

پس خاتمیت کے بارے میں گفتگو، دین اسلام کی ہمیشگی اور جاویدانی کے بارے میں گفتگو ہے۔ جب کسی چیز کے جاویداں ہونے کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے، اور وہ بھی ایک ایسی چیز

۱۔ یہ کتاب اردو زبان میں ''انسان اور تقدیر'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (مترجم)

۲۔ خدا نے محمد مصطفیٰؐ سے وعدہ کیا ہے کہ آپ کی رحلت کے باوجود آپ کا لایا ہوا یہ دین باقی رہے گا۔

کے بارے میں جو انسانی زندگی اور تاریخ بشر سے تعلق رکھتی ہو تو ایک گروہ کہتا ہے کہ کیا ممکن ہے کہ جبرِ تاریخ کے ہوتے ہوئے انسانی زندگی اور اسکی تاریخ میں کوئی چیز ہمیشہ اور جاویداں رہ سکے؟ جاویداں ہونا جبرِ تاریخ کے برخلاف ہے۔

اب ہم اس جبرِ تاریخ کی تفسیر کرنا چاہتے ہیں اور یہ وضاحت کرنا اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا اسکے کوئی درست معنی ہیں یا نہیں؟

اور اگر اسکے کوئی درست معنی ہیں تو کیا ان کا لازمہ یہ ہے کہ تاریخ بشر میں کوئی چیز جاویداں نہ رہے؟

جبرِ تاریخ دو لفظ ہیں: جبر اور تاریخ۔ ''جبر'' یعنی حتمی ہونا۔ جبر کا فلسفی مفہوم اسکے عوام میں رائج مفہوم سے مختلف ہے جس کے معنی زبردستی ہیں۔ خود لفظ ''جبر'' کے معنی ہیں حتمی ہونا ناقابلِ اجتناب ہونا بالفاظِ دیگر ضرور اور ہمارے فلاسفہ کی اصطلاح میں وجوب۔

اگر وہ کہتے ہیں کہ ایک چیز جبری ہے تو اسکے معنی ہیں حتمی ہے اسکے برخلاف ناممکن ہے۔ مثلاً اگر ریاضی کے مسائل میں کہتے ہیں کہ پانچ ضرب پانچ جبراً مساوی ہے پچیس کے تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ مساوات زور زبردستی قرار دی گئی ہے بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ اسکے برخلاف ہونا عقلاً محال ہے۔

جبرِ تاریخ سے کیا مراد ہے؟

مراد یہ ہے کہ تاریخی عوامل وہ عوامل جو انسان کی سماجی زندگی کی تاریخ میں مؤثر ہیں وہ جبری تاثیرات کے حامل ہیں۔

''جبری تاثیرات کے حامل ہیں'' سے کیا مراد ہے؟

مراد یہ ہے کہ ان عوامل کے اثرات اور ان کی اثر اندازی حتمی ہے اسکے برخلاف نہیں ہوسکتا۔ یہ ہیں لفظ ''جبرِ تاریخ'' کے معنی۔

اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ بات درست ہے اور ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے؟

کیا قرآن میں کوئی ایسی چیز آئی ہے جس نے جبرِ تاریخ کی نفی کی ہے یا اس کا اثبات کیا ہے؟

فلسفی نقطۂ نظر سے معاملہ کیا ہے؟

فلسفی مفہوم میں ''جبر'' کی دو اقسام ہیں' ایک طبیعت (Nature) میں پایا جانے والا جبر ہے' اصطلاحاً خلقت میں پایا جانے والا جبر' اور ایک تاریخ میں پایا جانے والا جبر ہے۔

خلقت اور طبیعت میں پائے جانے والے جبر سے مراد یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم موجود ہیں' اسکی خلقت اور آفرینش میں کچھ قطعی' ضروری' حتمی اور کسی صورت نا ٹوٹنے والے قوانین پائے جاتے ہیں' اس میں بدنظمی نہیں ہے' دنیا پر منظم قوانین کی حکمرانی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حوالے سے مادّہ پرستوں (Materialists) اور خدا پرستوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ پہلی صورت میں {یعنی اگر ہم مادّہ پرست ہوں تو} ہم کہتے ہیں کہ یہ قوانین خود اپنے بل بوتے پر قائم ہیں' اور اگر خدا پرست ہوں' تو کہتے ہیں کہ یہ مشیت الٰہی کا تقاضا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی رحم میں ایک نطفہ قرار پائے' تو خاص حالات میں' یعنی رحم صحت مند ہو' بیضے کی تولید کی قدرت رکھتا ہو' نطفہ بھی صحیح وسالم ہو' تو لازماً ایک بچے کے وجود کی بنیاد پڑے گی۔ اور بعد میں بھی خاص مراحل کو طے کرے گا' جو قرآنی تعبیر کے مطابق علقہ' مضغہ' ہڈیاں' گوشت اور اسکے بعد حیات اور روح کی پیدائش کا مرحلہ ہے' اسکے بعد بچہ ایک نومولود کی صورت دنیا میں قدم رکھتا ہے' نشوونما پاتا ہے' اور بڑا ہو کر ایک جوان بنتا ہے۔ اسکے بعد رفتہ رفتہ ادھیڑ عمری کا دور گزارتا ہے' بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے' اور آخر کار موت پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔

یہ اس دنیا کا ایک حساب اور قانون ہے۔ دنیا میں اسکے برعکس نظر نہیں آتا۔ ہم نے نہیں دیکھا کہ دنیا میں کوئی شخص ابتداً بوڑھا پیدا ہوا ہو' اسکے بعد ادھیڑ عمر کو پہنچا ہو' پھر جوان ہوا ہو' رفتہ رفتہ کم سن بچہ بنا ہو' پھر نومولود اور پھر جنین کی صورت اور پھر نطفے کی شکل میں ڈھلا ہو۔

بلکہ ہمیشہ حساب یہ ہوتا ہے' {جیسے کہ} قرآنِ کریم فرماتا ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّ شَیْبَةً. (۱) خدا نے

۱۔ سورۂ روم ۳۰۔ آیت ۵۴ {اللہ ہی وہ ہے جس نے تم سب کو کمزوری سے پیدا کیا ہے اور پھر کمزوری کے بعد طاقت عطا کی ہے اور پھر طاقت کے بعد کمزوری اور ضعیفی قرار دی ہے}

اس طرح رکھا ہے کہ تمہیں ناتوانی سے خلق کرے' تمہاری خلقت کی ابتدا ناتوانی سے ہو' یعنی تمہاری ہستی ضعف اور ناتوانی سے شروع ہو کر قوت وقدرت پر منتہی ہو' اور پھر اسکے بعد دوبارہ یہ طاقتیں اور قوتیں کم ہوں اور پیری اور فرسودگی کے دور تک پہنچیں۔ اگر کوئی شخص (وہ خدا کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو) یہ بات قبول کرے کہ کائنات میں موجود قوانین' عالم خلقت میں پائے جانے والے قوانین مسلّم ہیں' ان کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور یہ ناقابلِ اجتناب قوانین ہیں' تو پس اُس نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ طبیعت (Nature) میں جبر پایا جاتا ہے۔

یہاں ممکن ہے آپ معجزات کا مسئلہ اٹھائیں' اور کہیں کہ کیا وہ ان {قوانین} کے مخالف نہیں ہوتے؟ اجمالاً ہم عرض کریں گے کہ نہیں ایسا نہیں ہے' وہ ان {قوانین} کے مخالف نہیں ہیں۔ فی الحال یہ اس گفتگو کا موقع نہیں ہے۔

اب بات یہ ہے کہ جبرِ تاریخ سے کیا مراد ہے؟

جبرِ تاریخ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح ایک طبیعی (Natural) وجود' ایک پودا' ایک کیڑا' ایک حیوان' ایک سمندر ایک خاص قانون رکھتا ہے' اور اس خاص قانون کے ذریعے وجود میں آتا اور نابود ہوتا ہے' اسی طرح انسان کی سماجی اور اجتماعی زندگی کا بھی مجموعی طور پر اپنا ایک قانون ہے۔ تمام افرادِ بشر مل کر ایک اکائی (اور جسم) کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور افرادِ بشر اس جسم کے اجزا کی مانند ہیں۔

اس اکائی کی ایک سرگزشت اور تاریخ ہے اس کا ماضی اور مستقبل ہے' اسکے خاص اور معین نظام ہیں۔ اُسی طرح جیسے آپ جو ایک فرد ہیں' آپ کا بدن ایک نظام کا مالک ہے' جب آپ ڈاکٹروں سے پوچھتے ہیں' تو وہ کہتے ہیں کہ جناب آپ کی صحت یا بیماری ایک خاص اور معین نظام کے تابع ہے' اسی طرح ایک معاشرہ شناس بھی کہتا ہے کہ انسانی سماج کا بھی ہو بہو ایک جسم کی طرح اپنا مخصوص نظام اور قانون ہوتا ہے' وہ بھی منظم اور قطعی قانون کا مالک ہے۔

سماج اور تاریخ کا منظم اور قطعی قانون

اگر آپ یہ سوال کریں کہ ہم جو مسلمان ہیں' توحید پرست اور خداشناس ہیں' قرآن کی

پیروی کرتے ہیں' تو کیا اس ناطے ہمیں تاریخ کو ایک طرح کے قوانین اور قواعد کا مالک سمجھنا چاہیے' وہ بھی قطعی اور ایسے قواعد کا جن کی خلاف ورزی ممکن نہیں؟ اس کا (جواب یہ ہے کہ) ہمیں مسلمان' توحید پرست اور قرآن کے تابع ہونے کے ناطے اس بات کو قبول کرنا چاہیے کہ انسانی تاریخ' امم واقوام کی تاریخ ایک منظم' قطعی اور متعین قانون کی مالک ہے' اور ہمیں ان قوانین کو ماننا چاہیے اور اپنے آپ کو ان قوانین کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ اتفاقاً قرآنِ مجید نے بھی' کیونکہ وہ زیادہ تر لوگوں کی زندگی سے سروکار رکھتا ہے' بہت وضاحت کے ساتھ اس نکتے کو بیان کیا ہے کہ انسانی تاریخ ایک قطعی اور منظم قانون کی مالک ہے۔

قرآن کی بہت سی آیات میں ہم لفظ ''سنت'' یا ''سنن'' کو دیکھتے ہیں۔ یعنی قرآنِ مجید ''سنة الله'' {اللہ کی سنت} کے عنوان کے تحت کسی قوم کی سرگزشت اور اسکے انجام کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ سنتِ الٰہی یہ ہے' خدا کا طریقہ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر اقوام فلاں فلاں کردار کی مالک ہوں گی' تو اُن کا انجام یہ ہوگا' اور اگر نہیں' اُن کا کردار دوسری طرح کا ہوگا' تو ان کا انجام اس سے مختلف ہوگا۔ مثلاً یہ آیت جو فرماتی ہے: اِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (۱) انسانی تاریخ اور انسانی زندگی میں رائج ایک مسلّم اور قطعی قانون کا ذکر کرتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم فرعون اور اُسکے ساتھیوں کی سرگزشت بیان کرتا ہے۔ اُن کے ظلم وستم' استکبار اور ان کے دوسروں پر برتری اور امتیاز چاہنے کو بیان کرتا ہے' ان کے کفر اور کفران کا ذکر کرتا ہے' جو ان کی ہلاکت پر منتہی ہوتا ہے۔ اسکے فوراً بعد یوں فرماتا ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (۲) یعنی اس کا سبب یہ تھا کہ خداوندِ عالم کسی صورت کسی قوم سے اپنی دی گئی نعمت واپس نہیں لیتا' جب تک وہ قوم خود اُن باتوں میں تبدیلیاں پیدا نہ کرلے جو اسکی شخصیت' اخلاق اور عادات سے تعلق رکھتی ہیں' جب تک وہ خود اپنے آپ کو خراب نہ کرلے۔ لفظ ''لَمْ يَكُ'' حتمی اور لازم ہونے کے معنی دیتا

۱۔ سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۱

۲۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۵۳

ہے۔یعنی خداوندِ عالم کسی صورت ایسا نہیں کہ کسی قوم سے بلاوجہ کوئی نعمت چھین لے خدا کی خدائی کالازمہ یہ ہے کہ وہ ایسا نہ ہو۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی اس شکل میں کوئی تعبیر آئی ہے علما اس سے قطعیت ابدیت اور عمومیت مراد لیتے ہیں۔جیسے یہ آیت جسے علم اصول کے علما سند کے طور پر پیش کرتے ہیں: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلاً. (۱) ہم ایسے نہیں ہیں کہ کسی قوم کے درمیان پیغمبر بھیجنے سے پہلے اور اُس پر اچھی طرح اتمام حجت سے قبل اُس پر عذاب نازل کریں۔یعنی ہم کسی قوم یا فرد کو اُس پر اتمام حجت کر دینے اور اُسکے سامنے حقیقت بیان اور واضح کر دینے سے قبل عذاب میں مبتلا نہیں کریں گے۔علمائے اصول کہتے ہیں کہ یہ آیت قاعدۂ ''قبح عقاب بلا بیان'' (۲) کی تائید کرتی ہے۔

دیکھئے اگر اس آیت میں یوں آیا ہوتا کہ: مَا عَذَّبْنَاهُمْ قَبْلَ اَنْ نَبْعَثَ رَسولاً' تو یہ صرف اس بات کو بیان کرتی کہ ہم نے ماضی میں کسی قوم کے درمیان پیغمبر کو مبعوث کرنے سے قبل اُس قوم پر عذاب نازل نہیں کیا ہے۔اس وقت ہم کہتے کہ خداوندِ عالم نے ماضی کی خبر دی ہے اُس نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ آئندہ ایسا ہوگا' یہ نہیں کہہ رہا کہ ہمیشہ ہمارا دستور یہی ہے۔لیکن جب وہ یہ تعبیر استعمال کرتا ہے کہ: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلاً. {تو دراصل فرماتا ہے کہ} ہم ہرگز ایسے نہیں ہیں' یعنی یہ بات الوہیت اور ربوبیت کے مقام کے خلاف ہے کہ وہ کسی قوم پر اچھی طرح اتمام حجت کرنے سے پہلے اُس پر عذاب نازل کر دے۔

یہ آیت بھی جو فرماتی ہے کہ: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ. (۳) یعنی خدا کا ارادہ اور اللہ کی قطعی سنت یہ نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو حاصل کوئی نعمت اُس سے

۱۔سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔آیت ۱۵

۲۔عقاب بلا بیان: یعنی کسی کو کسی ایسے عمل پر سزا دینا جس کے متعلق اسے یہ نہ بتایا گیا ہو کہ اسکے ارتکاب پر اسے سزا دی جائے گی۔

۳۔سورۂ انفال ۸۔آیت ۵۳

چھین لے جب تک کہ خود وہ قوم اس نعمت کے زوال کے اسباب فراہم نہ کر لے۔ یعنی خود وہ قوم اپنے آپ کو بدل نہ ڈالے اُسکے اخلاق میں بگاڑ پیدا نہ ہو جائے اُن کے اندر سے عزم و حوصلے کا خاتمہ نہ ہو جائے اُن کا ایمان خراب نہ ہو جائے۔

پس لوگوں کے بارے میں خدا کی سنتوں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی: فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَبْدِيلًا وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللهِ تَحْوِيلًا ۔ (۱) {خداوندِ عالم نے} یہ آیات تاریخی حوادث کے ذکر کے بعد بیان کی ہیں۔ پس اجمالی طور پر اس نکتے پر کوئی اختلاف نہیں کہ انسانی تاریخ پر کچھ حتمی اور ایسی سنتوں اور قوانین کی حکمرانی ہے جن کی خلاف ورزی ممکن نہیں۔

ہم آپ کے سامنے شاہد اور گواہ کے طور پر ایک اور آیت پیش کریں گے اور یقین جانئے کہ پہلی مرتبہ یہ نکتہ قرآن ہی میں ذکر ہوا ہے۔ {اللہ رب العزت} انہی بنی اسرائیل کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل میں یوں فرماتا ہے: وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا. ہم نے کتاب میں (توریت میں یا لوحِ محفوظ میں اکثر کا کہنا ہے کہ مراد توریت ہے) حکم کر دیا ہے لکھ دیا ہے کہ تم روئے زمین پر دو مرتبہ فساد برپا کرو گے انتہائی درجے کا فساد و استکبار۔ جب پہلی مرتبہ فساد برپا کرو گے تو اسکے بعد ہم تم پر ایک ایسی قوم کو مسلط کریں گے جو انتہائی طاقتور ہوگی: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا. ہم تم پر ایک ایسی طاقتور اور قوی قوم مسلط کریں گے جو تمہاری داخلی زندگی میں نفوذ پیدا کر لے گی: فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ. وہ تمہارے گھروں تک میں رسائی حاصل کر لیں گے اور یہ ہمارا وہ وعدہ ہے جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں ہے: وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا. اسکے بعد تمہاری حالت بدل جائے گی تم توبہ کر لو گے اچھے انسان بن جاؤ گے تو ہم بھی تمہاری حالت بدل دیں گے: ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا. اسکے بعد ہم دوبارہ تمہارے لیے اپنی نعمتوں کا دروازہ کھول دیں گے تمہاری تعداد میں اضافہ کر دیں گے تمہارے

۱۔ سورۂ فاطر ۳۵۔ آیت ۴۳

مال و دولت اور طاقت و قدرت کو بڑھا دیں گے: اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا. یہ بات جان رکھو کہ اگر تم نیکی کرو گے تو یہ خود تمہارے فائدے میں ہوگی' کیونکہ نیکی کرنے اور نیک ہو جانے کے بعد تمہارے لیے نعمت ہے اور اگر تم نے برائی کی تو خود اپنے ساتھ برا کرو گے' کیونکہ برائی کرنے کے بعد زیاں' ذلت اور بدحالی ہے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ . جب دوبارہ تمہارا دل ذلت و خواری کو چاہے اور تم بگاڑ میں ڈوب جاؤ: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (۱) جب تم دوسری مرتبہ بگاڑ کا شکار ہو جاؤ گے اور ایک دوسری قوم آ کر تم پر مسلط ہو جائے گی' جو تمہیں برباد اور بے حال کر دے گی' تو اس دوسری مرتبہ بھی اگر تم توبہ کر لو اور اچھے انسان بن جاؤ' تو امید ہے کہ رحمتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہو جائے' لیکن: وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا' یہ ایک اہم جملہ ہے' یہ جملہ ایک قطعی اور عمومی سنت اور قاعدے کا ابلاغ کرتا ہے: وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا. جب بھی تم بگاڑ اور برائیوں کا رُخ کرو گے' تو ہم بھی تم سے منہ پھیر کر تم پر ایک دوسری قوم مسلط کر دیں گے' اور جب بھی تم خدا کی طرف پلٹ آؤ گے' تو ہماری رحمتوں کا رُخ بھی تمہاری جانب ہو جائے گا۔ یہ جملہ: وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا. یعنی ایک کلی' دائمی اور ہمیشہ رہنے والا قاعدہ ہے۔ یہ کلی قاعدہ صرف بنی اسرائیل کے لیے نہیں ہے' بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے۔

قرآنِ مجید انسانی تاریخ کے بارے میں اور اس بارے میں کہ انسانی تاریخ ایک خاص سنت کی پیروی کرتی ہے' تعجب انگیزی کی حد تک اصرار کرتا ہے۔ البتہ قرآن کریم دوسروں سے ایک منطقی فرق کا مالک ہے۔ اور وہ {فرق} یہ ہے کہ دوسرے اس نکتے پر یا تو توجہ نہیں دیتے' یا بہت کم توجہ دیتے ہیں کہ ''اخلاقی بگاڑ قوموں کی سعادت اور اُن کے مستقبل پر اثر انداز ہوتا ہے''۔ {جبکہ} قرآنِ مجید جب انسانی تاریخ کے فلسفے کا ذکر کرتا ہے' تو اسکی تفسیر میں کہتا ہے کہ اقوام و ملل کی سعادت ان کے علم' پاکیزہ اخلاق اور معنویت سے وابستہ ہے۔ قرآنِ مجید اس بات پر حیرت

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۴ تا ۸

انگیز حد تک اصرار کرتا ہے کہ کسی قوم کی معنویت اسکے مستقبل پر انتہائی تاثیر کی حامل ہوتی ہے۔ یعنی جو چیز بہت زیادہ قرآن سے مختص شمار کی جاتی ہے' قطع نظر اسکے کہ قرآن اُس کلی فلسفے کو قبول کرتا ہے' بلکہ اسے دنیا میں اوّلین بار بیان کرتا ہے' لہٰذا فرماتا ہے: وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ .(۱)

پس اگر ہم کلی طور پر جبرِ تاریخ کا مطالعہ کریں' تو دیکھتے ہیں کہ یہ ایک صحیح اور درست بات ہے' اس معنی میں کہ انسانی تاریخ کچھ منظم قوانین اور ضابطوں کے تحت حرکت کرتی ہے۔

جبرِ تاریخ اور جاویدانگی

اب ہم اُس نکتے کی جانب آتے ہیں' جسے یہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ ان حضرات نے جبرِ تاریخ کا لازمہ یہ سمجھا ہے کہ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ اور جاویداں نہیں رہتی۔ اس نکتے کی بنیاد کیا ہے؟! ان حضرات سے ہمارا اختلاف اسی بارے میں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ تاریخ کے ایک طرح کے حتمی یا ان کے بقول جبری (۲) قوانین کے مالک ہونے کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ انسانی زندگی پر کسی ثابت اصول کی حکمرانی نہ ہو اور کوئی چیز جاویدانگی کی مالک نہ رہے۔

ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ تاریخ پر کچھ حتمی قوانین کی حکومت ہے' اور ان قوانین کو پہچاننا چاہیے' لیکن کس طرح؟ ان حضرات کا کہنا ہے کہ یہ حتمی قوانین دنیا یا انسانی تاریخ میں کسی بھی چیز کے ہمیشہ باقی رہنے میں رکاوٹ ہیں۔ بتایئے اس بات کی کیا بنیاد ہے؟!

۱۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۹۶ [اور اگر اہلِ قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لیے زمین اور آسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے]

۲۔ ہر چند یہاں ایک اچھے لفظ کا انتخاب نہیں کیا گیا ہے' کیونکہ جب "جبر" کہا جاتا ہے' تو اس سے بعض اذہان میں زور' زبردستی کا مفہوم آتا ہے۔ یعنی ایک عامل آئے اور دوسرے عامل سے اس کا اختیار چھین لے' جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔

جب ہم ''جبرِ تاریخ'' کہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں تاریخ کے عوامل کو پہچاننا چاہیے، ہمیں جاننا ہوگا کہ تاریخ کے عوامل کیا ہیں؟

یہ جبرِ تاریخ جس کا ذکر یہ حضرات کرتے ہیں اس میں اور قدیم زمانے سے جس چیز کو ہم قضاوقدر کہتے ہیں اُس میں فرق یہ ہے کہ قضاوقدر میں ماورائے طبیعت عوامل پیشِ نظر ہوتے ہیں، جبکہ جبرِ تاریخ میں مادّی اور طبیعی عوامل مدِنظر ہوتے ہیں۔ وہ شخص جو ''قضاوقدر'' کہتا ہے، وہ تاریخ کے ماورائے طبیعت عوامل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہتا ہے اور یہ جو ''جبرِ تاریخ'' کہتا ہے، اسکے پیشِ نظر تاریخ کے مادّی عوامل ہوتے ہیں۔

ہم تاریخ کے مادّی عوامل کے منکر نہیں ہیں۔ ہم ماورائے طبیعت کے قائل ہیں اور طبیعت اور اُسکے عوامل کے منکر نہیں ہیں، وہ تمام عوامل جنہیں مادّہ پرست لوگ قبول کرتے ہیں، ہم {بھی} انہیں قبول کرتے ہیں، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ہم طبیعی عوامل کو وجود اور ہستی کا ایک پہلو سمجھتے ہیں، اور ہستی کے لیے ایک اور پہلو کے بھی قائل ہیں۔ فی الحال ہم طبیعت کے لحاظ سے گفتگو کر رہے ہیں۔

عواملِ تاریخ کیا ہیں؟

تاریخ کو انسان وجود بخشتا ہے۔ تاریخ کے عوامل انسان اور اسکی ضروریات اور اُسکی جبلّتیں ہیں۔ تاریخ کو انسان کے وجود سے باہر کی کوئی چیز وجود میں نہیں لاتی۔ انسان اور اُسکی ضروریات ہیں جو تاریخ کا پہیا گھماتے ہیں۔

انسان کی ضروریات کیا ہیں؟

انسان کی ضروریات بہت زیادہ ہیں، انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی بعض ضروریات اوّلی ہیں اور بعض ثانوی۔ انسان کی ثانوی ضروریات کی کوئی حد و حساب نہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ انسان کی اوّلی ضروریات کیا ہیں۔ کیونکہ انسان ثانوی ضروریات کو اپنی اوّلی ضروریات ہی کے لیے چاہتا ہے۔ مثلاً انسان کو روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انسان کو روپے پیسے کی ضرورت ایک ثانوی ضرورت ہے، اس کی اوّلی ضرورت نہیں۔

یعنی کیا؟

یعنی تنہا پیسا انسان کی ضروریات میں سے کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتا' انسان کا پیٹ نہیں بھرتا' اسکی بیماریوں میں سے کسی بیماری کو دور نہیں کرتا۔ یعنی اگر پیسے کو بیماری کی جگہ پر رکھ دیں' تو وہ کسی قسم کا اثر مرتب نہیں کرے گا۔ انسان اگر بھوکا ہو' تو کرنسی نوٹ چبانا اسے کوئی فائدہ نہ دے گا' اگر بھوکا ہو اور ایک کمرے میں محصور ہو اور وہاں کوئی غذا نہ ہو لیکن وہاں دنیا بھر کی کرنسی بھری ہوئی ہو' تب بھی وہ بھوک سے مر جائے گا۔ انسان کو لباس کی ضرورت ہے۔ پیسا لباس نہیں بن سکتا۔ انسان کو شریکِ حیات کی ضرورت ہے۔ پیسا انسان کے لیے شریکِ حیات نہیں ہو سکتا۔ اسے ایک گھر کی ضرورت ہے۔ پیسا گھر نہیں بن سکتا۔

پیسا انسان کی ثانوی ضرورت ہے۔ یعنی جب انسان اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے' اور اس زندگی میں معاشرے کے ہر فرد یا اسکے ایک گروہ کے ذمے {معاشرے کی} کسی ضرورت کو پورا کرنا ہوتا ہے' اور معاشرے پر انفرادی ملکیت کی حکمرانی ہو جاتی ہے اور افرادِ معاشرہ کو ایک دوسرے کے ساتھ مبادلے (exchange) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہر فرد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد پیداوار کا دوسروں کے ساتھ مبادلہ کرے۔ افرادِ معاشرہ کو باہمی مبادلے کی ضرورت پیش آتی ہے اور شیخ الرئیس {بوعلی سینا} کے بقول معارضے کی ضرورت ہوتی ہے' اپنی متاع کو مبادلے کے لیے پیش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے' یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں پیسا ان اموال کے درمیان رابطہ بن جاتا ہے جن کے مبادلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں انسان کو پیسے کی ضرورت پیش آتی ہے' البتہ ایک ثانوی ضرورت۔ یعنی کیونکہ انسان کی زندگی اجتماعی ہے' اور اجتماعی زندگی میں مبادلہ ہوتا ہے' پس اسے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انسان کسی جنگل میں چلا جائے' اور وہاں انفرادی زندگی بسر کرے' تو پھر اسے پیسے کی ضرورت نہیں۔ یا اگر اسکی زندگی اجتماعی ہو' لیکن اس میں مبادلے کی ضرورت نہ ہو' یعنی مثلاً زندگی مطلق طور پر اشتراکی ہو جائے' اور انفرادی ملکیت کا یکسر خاتمہ ہو جائے' تمام افرادِ بشر ایک گھرانے کی مانند ہو جائیں اور حکومت ان سب کے لیے خوراک اور لباس کا بندوبست کرے' تو اس صورت میں بھی پیسے کی ضرورت نہیں۔

انسان کی اکثر ضروریات ثانوی ہوتی ہیں' نہ کہ اوّلی۔ ہماری اس گفتگو کے اعتبار سے اہم ضروریات اوّلیہ ہیں۔

ماکسزم کی غلط فہمی

یہ حضرات جب جبر تاریخ کی گفتگو کرتے ہیں' تو کہتے ہیں کہ جبر تاریخ کی رو سے کسی چیز کو ہمیشہ نہیں رہنا چاہیے۔ ان لوگوں نے یہ تصور کرلیا ہے کہ انسان کی اوّلی ضرورت محض اسکی اقتصادی ضرورت ہے' بقیہ ساری کی ساری ضروریات ثانوی ضروریات ہیں۔ انسان کی روحانی ضروریات' علم' تقویٰ اور عدل وانصاف کی ضرورتیں' ثانوی ضروریات ہیں۔ زیبائی اور اخلاق کی ضروریات' ثانوی ہیں۔ ان لوگوں نے انسان کو ایک حیوان فرض کیا ہوا ہے' جس کا صرف پیٹ ہے' اور وہ ہر چیز کی بنیاد پیٹ کو سمجھتے ہیں۔ اسکے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ انسان کے اقتصادی عوامل میں تغیر رونما ہوتا ہے' لہٰذا کہتے ہیں کہ جب اقتصاد میں تغیر آتا ہے' تو وہ انسانی زندگی کی ہر چیز کو بدل ڈالتا ہے' اور انسانی زندگی میں کوئی ثابت و پائیدار چیز نہیں پائی جاتی۔ اور اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں: جبر تاریخ کا لازمہ یہ ہے کہ ہر چیز بدل جائے۔ کہتے ہیں کہ جبر تاریخ کا لازمی تقاضا تمام چیزوں کو بدل ڈالنا اور کسی چیز کا ہمیشہ اور جاویداں نہ ہونا ہے۔ کیونکہ ذرائع پیداوار بدلتے رہتے ہیں اور اقتصاد انسانی زندگی کی بنیاد ہے' لہٰذا اس میں تبدیلی کی وجہ سے انسانی زندگی کے تمام شعبے جو اس بنیاد پر کھڑے ہیں' وہ تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ہم ان حضرات سے کہتے ہیں کہ جناب! علم کیا ہے؟

وہ کہتے ہیں: علم اقتصاد کی ایک شاخ ہے اور اسکی اپنی کوئی مستقل بنیاد نہیں۔

ہم کہتے ہیں: زیبائی کیا ہے؟

وہ کہتے ہیں: ایک فرع کے سوا کچھ نہیں' یہ اقتصاد کے تنے سے پھوٹنے والی ایک اور شاخ ہے۔

اسی طرح یہ لوگ اخلاق اور دین کو اقتصاد کی دوسری شاخیں قرار دیتے ہیں۔ اور (ان کے بقول) کیونکہ انسان کی اقتصادی صورتحال' جو ہر چیز کی بنیاد ہے' جاویداں اور ہمیشہ رہنے والی نہیں' اس لیے دنیا میں کوئی چیز جاویدانگی اور ہمیشگی کی مالک نہیں۔ اسی بنا پر لوگوں کے درمیان یہ فکر وجود

میں آئی ہے کہ وہ ہر چیز کے مقابل فوراً جبرِ تاریخ کے حربے سے کام لیتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ جبرِ تاریخ ہر چیز کو بدل ڈالتا ہے۔

نہیں جناب {ایسا نہیں ہے} 'جبرِ تاریخ درست ہے' اور جس طرح جبرِ تاریخ یہ تقاضا کرتا ہے کہ انسانی زندگی کے بعض مسائل میں تغیر رونما ہو' اسی طرح جبرِ تاریخ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی کے بعض حقائق اپنی جگہ ثابت رہیں۔

کیوں؟

کیونکہ انسانی ضروریات دو قسم کی ہیں' کچھ ضروریات ثابت ہیں' اور کچھ ضروریات متغیر۔ ثابت ضروریات انسانی زندگی میں کچھ حقائق کے ثابت رہنے کا ایک عامل (factor) ہیں' {جبکہ} متغیر ضروریات' متغیر کرنے کا ایک عامل۔ پس یہ موضوع درست نہیں ہے' جسے انہوں نے اس بات کا بہانہ بنایا ہے کہ جوں ہی یہ کہا جاتا ہے کہ دین یا فلاں حقیقت جاوید ہے فوراً وہ کہتے ہیں کہ یہ جبرِ تاریخ کے ساتھ سازگار نہیں' دراصل ان لوگوں نے جبرِ تاریخ {کے مفہوم} کو سمجھا ہی نہیں ہے۔

پہلے آپ جبر کی وضاحت کیجیے' اسکے بعد ہمیں بتایئے کہ تاریخ کا پہیا گھمانے والے عوامل کیا ہیں؟ اور پھر یہ بتائیں کہ ان عوامل میں سے کون سے عوامل ثابت ہیں اور کون سے متغیر۔ اگر یہ پتا چلے کہ تاریخ کو حرکت دینے والے عوامل بہت سارے ہیں اور اُن میں سے بہت سے ثابت اور غیر متغیر ہیں' تو پس پھر خود جبرِ تاریخ کا تقاضا ہے کہ انسانی زندگی میں کچھ حقائق ثابت اور غیر متغیر رہیں۔

چھٹا خطاب

دین خاتم میں علما کا کردار

چھٹا خطاب

دین خاتم میں علما کا کردار

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.... اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

"وَ مَا کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَیْهِمْ لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ."(۱)

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے:

"اِنَّ مِنْ اَحَبِّ عِبَادِاللّٰہِ اِلَیْہِ عَبْداً اَعَانَهُ اللّٰہُ عَلٰی نَفْسِہٖ...."(۲)

ہم نے اس خطبے کو (البتہ ہم نے آپ کی خدمت میں اس خطبے کا صرف ایک حصہ پڑھ کر سنایا ہے) خاص طور پر پڑھا ہے' کیونکہ ہم اس خطبے کے چند جملوں کی آپ کے سامنے توضیح و تفسیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کلام امیر المومنینؑ کے انتہائی عالی' لطیف اور نورانی فرمودات میں سے ہونے کے ساتھ ساتھ' اُن جملوں اور کلمات میں سے ہے جنہیں ان کے معنی اور مفاہیم پر توجہ دیے بغیر اگر بالفرض' صرف تبرکاً ہی پڑھنا چاہیں' تب بھی یہ اس قابل ہیں۔

۱۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۲۲

۲۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۸۷ {اللہ کی نگاہ میں سب سے محبوب بندہ وہ ہے جس کی خدا نے اُسکے نفس کے خلاف مدد کی ہے}

یہ خطبہ درحقیقت ایک عالم دین میں پائی جانے والی خصوصیات کے بارے میں ہے' حالانکہ خطبے کی ابتدا سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی' اور ہم نے نہیں دیکھا کہ اس خطبے کا ذکر علما (البتہ حقیقی اسلامی علما) کے اوصاف کے ذیل میں کیا گیا ہو اور کہا گیا ہو کہ اس خطبے میں وہ شرائط بیان کی گئی ہیں جو ایک دینی عالم میں ہونی چاہئیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ خطبے کی ابتدا میں اس کا عنوان اس نکتے پر نہیں ہے اور اسکے ابتدائی جملوں سے بھی یہ بات پتا نہیں چلتی ہے۔

لیکن یہ اوصاف' ایک مسلمان عالمِ دین کے اوصاف ہیں۔ یعنی اسلام ایک ایسے عالم کو مرجع دینی کا عنوان دیتا ہے' جو اس خطبے میں بیان کی گئی صفات کا مالک ہو۔

آج کی شب جبکہ ہماری گفتگو خاتمیت کے بارے میں ہے' ہم نے کس مناسبت سے آیت فَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ.... کو' جو آیت ''تفقہ'' یا آیت ''نفر'' کے نام سے معروف ہے ایک عالمِ دین کے اوصاف کے بارے میں اس خطبے کے ساتھ پیش کیا ہے؟

یہ مناسبت ہم عرض کرتے ہیں۔

ہم نے گزشتہ جلسات میں مختلف پہلوؤں سے اس گفتگو کی اہمیت کے متعلق ذکر کیا تھا' ہم نے اُس آیت کے بارے میں گفتگو کی تھی جس میں لفظ ''خَاتَمَ النَّبِيِّنَ'' آیا ہے' اور اسکے بعد وہ انتہائی معروف اور عام سوال اٹھایا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ نبوت ایک معین نکتے پر پہنچنے کے بعد ختم ہو جائے؟ کیوں نبوت ہر زمانے میں جاری نہیں رہی؟ گزشتہ صدیوں میں مسلسل انبیا کی آمد کا مقصد کیا تھا؟ آنے والے انبیا میں سے بعض جن کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہ تھی (مشرّع) صاحبِ شریعت تھے' نئے قوانین لائے تھے' اور بعض دوسرے انبیا سابقہ شریعت کے تابع تھے۔

ختمِ نبوت کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی قبول کرنی چاہیے کہ خاتم الانبیاؐ کے بعد اب نہ {گزشتہ انبیا کی شریعت کے} تابع انبیا کی آمد کا فلسفہ وجود رکھتا ہے اور نہ کسی ایسے پیغمبر کے آنے کا فلسفہ جو شریعت کو بدل دے اور سابقہ شریعت کی جگہ کوئی نئی شریعت لے آئے۔

آج کی رات ہم ان مسائل پر دوبارہ بات کرنا نہیں چاہتے' فہرست وار بس اسی قدر اشارہ کریں گے کہ اس کا ہماری آج رات کی گفتگو سے ربط واضح ہو جائے۔

علما کی دو بڑی ذمے داریاں

ہم نے اُن تقاریر میں جو نکات بیان کیے اُن میں یہ بھی تھا کہ خاتم الانبیاؐ کے بعد کے دور اور اس سے پہلے کے ادوار کے درمیان ایک فرق یہ ہے کہ سابقہ ادوار میں انسان ایک ایسا دور گزار رہا تھا جسے ہم علمی اعتبار سے ''دورِ قبل از بلوغ'' کا نام دیتے ہیں۔ اُن ادوار میں گزشتہ شریعتوں کا احیا صرف اس صورت میں ممکن ہوتا تھا کہ وہ انبیا جن پر وحی کے ذریعے باتیں الہام کی جاتی ہیں وہ آئیں اور لوگوں پر مسائل واضح کریں۔ علم اور عالم نے اس قدر ارتقا حاصل نہیں کیا تھا کہ وہ انبیا کی چھوڑی ہوئی تعلیمات کی حفاظت کر سکیں اور انہیں بچا کر رکھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے سوا کوئی آسمانی کتاب باقی نہیں رہی، واحد آسمانی کتاب جو اپنی اصل حالت میں محفوظ رہی ہے وہ قرآن ہے۔ آپ قرآن کے سوا کوئی ایک بھی آسمانی کتاب ایسی نہیں لا سکتے جس کے متعلق کوئی قطعیت اور یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ یہ وہی کتاب ہے جو اس کتاب کو لانے والا پیغمبرؑ لے کے آیا تھا۔ گزشتہ زمانے کے انسان کی حالت ہو بہو ابتدائی جماعتوں (classes) کے بچے کی سی تھی جو الف ب کا قاعدہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس قاعدے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دور پھینکتا رہتا ہے۔

انسان کو اُس دور کے بعد، یعنی دورِ خاتمیت میں کم از کم ایک امتیاز حاصل ہے، اور وہ یہ ہے کہ اُس نے اپنی آسمانی کتاب کی، جو اصل اور مرجع اصلی ہے، حفاظت کی، اپنے پیغمبر کی سنتوں میں سے بھی کچھ قطعی اور یقینی تعلیمات کی حفاظت کی، اب اسکے بعد اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ کچھ لوگ آکر وحی کے ذریعے {ہدایت پائیں اور} یہ کہیں کہ جناب آپ کے پاس اس قسم کی آیات اور آسمانی احکام موجود ہیں۔ انسان نے خود اپنے علم اور عقل کی ترقی کے ذریعے اپنے پیغمبر کی تعلیمات کی حفاظت کی ہے، اب اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ ایک فرد آئے اور کہے کہ تمہارے پیغمبر پر ایک سورہ نازل ہوا تھا جو یوں تھا کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ....

اسی بنا پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا تھا: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ. (۱) علما انبیا کے جانشین

۱۔ اصول کافی۔ ج ۱۔ ص ۳۲

ہیں۔کس بات میں جانشین ہیں؟ کیا اس بات میں کہ اُن پر{ بھی انبیا کی مانند} وحی نازل ہوتی ہے؟نہیں'اس بات میں کہ وہ انبیا کی چھوڑی ہوئی تعلیمات کے محافظ اور نگہبان ہیں۔

ہاں انبیا کی چھوڑی ہوئی تعلیمات کی حفاظت کی ذمے داری کے علاوہ بھی ایک ذمے داری ہے'جو اہمیت کے لحاظ سے کم تر نہیں'اور وہ ہے جزئیات کو کلیات پر منطبق کرنے کی ذمے داری'فروع کو اصول پر تطبیق دینا اور اُن کی طرف پلٹانا جس کا نام ''اجتہاد'' ہے۔محمد اقبال پاکستانی {علامہ اقبال} کا کیا خوبصورت جملہ ہے'جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:اسلام میں اجتہاد دین کی قوتِ محرکہ ہے۔

وہ خطبہ جسے ہم نے پڑھا'اُس میں امیر المومنینؑ کا ایک جملہ ہے'جس کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ یہ جملہ انمول ہے'بے بہا ہے'اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ اس خطبے میں جو صفات بیان کی گئی ہیں'وہ صرف مومنین اور متقین سے مخصوص نہیں ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

''قَدْنَصَبَ نَفْسَهُ لِلّٰهِ(سُبْحَانَهُ) فِی اَرْفَعِ الْاُمُورِ.''

اپنے آپ کو اُس بلند ترین درجے پر لے جاتا ہے کہ اسکے بعد اسلام میں اس سے بلند کوئی درجہ اور مقام نہیں۔

وہ کیا مقام ہے؟

''مِنْ اِصْدَارِ کُلِّ وَارِدٍ عَلَیْهِ'وَتَصْیِیرِ کُلِّ فَرْعٍ اِلیٰ اَصْلِهِ.''(۱)

ہر آنے والے کو(جو سوال بھی اُس سے کیا جاتا ہے)جواب دیے بغیر واپس نہیں لوٹاتا'بلکہ اُسے {اُس سوال کو} اپنے اس روحانی اور فکری کارخانے میں داخل کرتا ہے'اُسے حل کرتا ہے'اور اس حل کیے ہوئے کو باہر پیش کرتا ہے'اور اس بات کو جانتا ہے کہ کس فرع اور شاخ کو کس تنے اور جڑ سے متصل کرنا چاہیے'کس جز کو کس کُل پر پلٹانا چاہیے۔

۱۔نہج البلاغہ۔خطبہ ۸۷{اپنے نفس کو بلند ترین امور کی خاطر راہِ خدا میں آمادہ کرلیا ہے'کہ ہر آنے والے مسئلے کو حل کردے گا اور فروع کو اُن کی اصل کی طرف پلٹادے گا}

لہٰذا ہماری گفتگو اس مسئلے کے بارے میں ہے' جو خاتمیت کے مسئلے کی ایک فرع ہے' {یعنی} ''اسلام میں عالم دین کے فرائض اور کردار''۔

دین خاتم میں علما کی ضرورت

ہم پر لازم ہے کہ آپ کے لیے اس نکتے کی وضاحت کریں' کیونکہ جب تک اس کی وضاحت نہ ہو' مقصد واضح نہیں ہوگا۔ اسلام سمیت ہر دین بہرصورت ایک ایسے طبقے' افراد اور گروہ کا محتاج ہے جو اس دین کے علما' اسے جاننے والے اور اسکے ماہر ہوں۔ دنیا کے تمام ادیان میں {ان خصوصیات کے حامل افراد پر مشتمل} ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جسے وہ مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ کبھی انہیں کَہَنہ {کاہن کی جمع} کہا جاتا ہے' عیسائی انہیں ''پادری'' کہتے ہیں' قرآن میں اس کا عربی ''قسّیس'' آیا ہے۔ عصر قرآن میں یہودی اپنے علما کو ''احبار'' کہا کرتے تھے۔

کیا اسلام ایک ایسے طبقے کا وجود قبول کرتا ہے جو عالم دین ہو؟

ہاں' قبول کرتا ہے' اسکے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پس اگر کوئی یہ خیال کرے کہ ہم مسلمان ہیں' لیکن ہمیں کسی عالم دین کی ضرورت نہیں' تو یہ ایک فضول خیال ہوگا۔ دین کو ماہرین کی ضرورت ہے۔ اگر کسی دین میں عالم دین نہ ہوں' تو جہلا اس دین کی کسی چیز کو باقی نہیں رہنے دیں گے۔ خصوصاً اسلام میں جو کہ دین خاتم ہے' علما ایک بڑا رکن شمار کیے جاتے ہیں۔ دور حاضر میں انبیا کے بہت سے فرائض کی ادائیگی علما کے ذمے ہے۔

البتہ ایک نکتہ ایسا ہے جس پر بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ {اور وہ یہ ہے کہ} بہت سے معاملات ایسے ہیں جنہیں اسلام نے علما کے لیے قبول نہیں کیا ہے۔ جو کچھ اسلام نے علمائے دین کے بارے میں کہا ہے' اگر کوئی اس پر غور کرے' اور جو کچھ اس بارے میں دوسرے ادیان نے کہا ہے' اُن سے اس کا موازنہ کرے' تو یہ اسے اسلام کے معجزات میں سے دکھائی دے گا' {اسے محسوس ہوگا} کہ یہ دین کس قدر منطقی اور معقول دین ہے۔ جس طرح اسکے دوسرے تمام احکام بقیہ ادیان پر امتیاز رکھتے ہیں' اُسی طرح جو کچھ اس نے علما کے بارے میں کہا ہے وہ بھی امتیاز کا مالک ہے' معقول اور منطقی ہے۔

ہم پہلے اس معاملے کے منفی پہلوؤں کو آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

بعض ادیان میں علمائے دین کے منفی پہلو

دنیا کے بعض ادیان میں اُن کے علمائے دین کا ایک مخصوص ذات سے ہونا لازم ہے۔ یعنی صرف ایک مخصوص ذات کے لوگوں ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عالم اور مرجع دینی بن سکتے ہیں اور انہی کو یہ امتیاز حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہودیوں میں بنی اسرائیل کے اسباط میں سے لاوی کی اولاد ہی عالم دین ہو سکتی ہے ان کے سوا کوئی اور نہیں۔ ہمارے اپنے ایران میں دین زردشت میں (البتہ زردشتیوں کے پیشواؤں کی قائم کردہ بدعتوں میں سے ہے) صرف ایک مخصوص طبقہ یعنی خود موبد (زردشتیوں کا دینی پیشوا) اور اُسکی اولادیں ہی موبد بننے کا حق رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک انسان جو تاجر ہے وہ خود یا اس کا بیٹا ان کے یہاں مذہبی رہنماؤں کے طبقے میں شامل نہیں ہو سکتا یا ساسانی ایران میں ایک بڑھئی یا کسان کا بیٹا بنیادی طور پر مطلقاً بند اور مقفل طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً فوجی اور فوجی کے بیٹے کے سوا کوئی فوجی نہیں بن سکتا تھا۔ اگر اتفاقاً کسی اور طبقے کا کوئی فرد فوج میں شامل ہونا چاہتا تو اس قدر ضابطے (formalities) نافذ کیے جاتے کہ شاید ہی کوئی (انہیں پورا کر کے فوج میں) شامل ہو پاتا۔

کیا اسلام میں کوئی مخصوص قوم طبقہ یا ذات ہے کہ بس صرف اُسی سے تعلق رکھنے والے افراد عالم دین بن سکتے ہوں؟

نہیں (ایسا نہیں ہے) اس بات کو سب ہی جانتے ہیں۔

کیا مثلاً صرف سادات کیونکہ اولادِ رسول ہیں عالم دین بن سکتے ہیں؟

نہیں۔

کیا صرف علما کے بچے (عالم دین بن سکتے ہیں)؟

نہیں جناب۔ ایک دیہاتی بچہ جس کے آباؤ اجداد دیہاتی ہیں اور ان کی زندگی ڈھور ڈنگر کے درمیان گزری ہے وہ بھی آ کر دینی علوم حاصل کرتا ہے دوسروں سے آگے بڑھتا ہے اور آخر کار مرجع تقلید بن جاتا ہے۔ اکثر مراجع تقلید کا تعلق انہی طبقات سے تھا۔ اتفاقاً کم ہی ایسا ہوا

ہے کہ اعیان واشراف کے طبقات' حتیٰ بڑے علما کی اولادوں میں سے کوئی بڑا عالم یا مرجع تقلید پیدا ہوا ہو۔

ایک اور منفی پہلو' ایک خاص نام قرار دینا ہے۔ بہت کم افراد اس نکتے کی جانب توجہ رکھتے ہیں۔ اسلام نے علمائے دین کے لیے کسی خاص نام یا عنوان کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ اُن ادوار {میں دوسرے ادیان} کے علمائے دین کا ایک خاص نام ہوا کرتا تھا' کشیش اور قسیس' یا رُہبان جو اُن لوگوں کے زُہاد ہوا کرتے تھے' احبار جو یہودیوں کے علما ہوتے تھے' اسکے باوجود اسلام نے فقط ''عالم'' کہا ہے' وہ نام جو حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

اگر آپ کہیں کہ وہ نام جو بعد میں پیدا ہوئے' وہ نام جن سے آج اس طبقے کو پکارا جاتا ہے {مثلاً}: شیخ' ملا' آخوند' روحانی' یہ کیا ہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ وہ نام ہیں جن کا انتخاب بعد میں خود لوگوں نے کیا ہے۔ البتہ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ یہ بدعت ہے' کیونکہ یہ نام کوئی اس نیت سے نہیں پکارتا کہ یہ اسلام نے دیے ہیں۔ اگر واقعاً کوئی یہ خیال کرے کہ اسلام کے احکامات میں سے ایک حکم یہ ہے کہ عالمِ دین کو شیخ کہنا چاہیے' آخوند یا ملا کہنا چاہیے' تو یہ اُسکی غلطی ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے' چوتھی صدی ہجری تک' اور شاید پانچویں صدی ہجری کے اوائل تک' ظہورِ اسلام کو چار صدیاں گزر جانے کے بعد تک ہمیں کوئی ایک بھی عالمِ دین ایسا نہیں ملتا جس کا لوگوں نے کوئی مخصوص نام رکھا ہو' مثلاً اُسکے لیے لفظ ''شیخ'' کا استعمال کیا ہو' صرف چوتھی اور پانچویں صدی میں ہمیں نظر آتا ہے کہ علما' فلاسفہ اور بزرگوں کے درمیان اکابر علما کے لیے لفظ ''شیخ'' کا استعمال ہوا ہے' مثلاً شیعوں نے شیخ طوسی کو ''شیخ'' یعنی بہت زیادہ صاحبِ علم' کثیر علم کا مالک کہا ہے' کیونکہ وہ واقعاً بہت زیادہ علم و دانش کے مالک تھے۔ فلاسفہ اور منطقیین نے بوعلی سینا کو ''شیخ'' کہا' علمائے ادب نے عبدالقادر جرجانی کو ''شیخ'' کہا' شعرا نے سعدی کو ''شیخ'' کہا' اسکے بعد یہ عام ہو گیا اور ہر طالبِ علم کو ''شیخ'' کہا جانے لگا۔

جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے ظہورِ اسلام کو دس صدیاں گزر جانے کے بعد تک لفظ آخوند اور ملا کسی ایک فرد کے لیے بھی استعمال نہیں ہوا' یہ القاب صفویوں کے زمانے میں پیدا ہوئے

ہیں۔ حتیٰ ان الفاظ کے معنی کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ { مثلاً } آخوند سے کیا مراد ہے؟ کہتے ہیں کہ یہ ''آقا خواندہ'' کا مخفف ہے۔ بعض کے خیال میں ''ملا'' لفظ ''مولا'' کی تحریف شدہ صورت ہے۔ مجھے اب تک نہیں مل پایا ہے کہ صفویوں کے دور سے قبل لوگ کسی عالم کے لیے لفظ آخوند یا ملا کا استعمال کرتے ہوں۔ لفظ 'روحانی'' جو ایک انتہائی نومولود لفظ ہے' خود ہمارا ہم عصر ہے' یعنی ہماری نسل کا معاصر ہے۔ آپ ساٹھ ستر سال پہلے تک' یعنی مشروطہ سے قبل تک ایک بھی ایسی جگہ نہیں دکھا سکتے جہاں علمائے دین کو روحانیین کہا گیا ہو۔ یہ { لفظ } عیسائیت سے ماخوذ ہے۔ عیسائی اس بنیاد پر اپنے علما کو روحانیون کہتے تھے کہ اُن کی نظر میں روح تن سے' آخرت دنیا سے' معنی ظاہر سے جدا ہیں' اور عالم دین کو تارک الدنیا ہونا چاہیے۔ بعد میں یہ اصطلاح ہمارے یہاں ایران میں عام ہوگئی۔

بہر حال اسلام نے جو کام نہیں کیے' اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے علمائے دین کے لیے کسی خاص نام کا انتخاب نہیں کیا ہے' اُسی طرح جیسے اُس نے { اُن کے لیے } کسی مخصوص لباس کا انتخاب بھی نہیں کیا ہے۔ یعنی اسلام نے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ لوگ جو علمائے دین ہیں' کیونکہ علمائے دین ہیں اس لیے اُن کا ایک مخصوص لباس ہونا چاہیے۔

البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ وہ افراد جو اپنے سر پر عمامہ رکھتے ہیں' یا عبا پہنتے ہیں' اُن کا یہ لباس مجموعی طور پر آج دوسروں کے درمیان رائج لباس کے مقابلے میں پیغمبرؐ کے لباس سے زیادہ نزدیک ہے۔ یہ { لباس } علما سے مخصوص نہیں ہے' آپ بھی اگر اس نیت سے کہ کیونکہ پیغمبر اکرمؐ اپنے سر پر عمامہ رکھتے تھے' اس لیے { اپنے سر پر } عمامہ رکھ لیں اور { اس عمل سے } آپ کا مقصد پیغمبر کی تاسی ہو' تو شاید آپ کا یہ عمل اجر و ثواب کا حامل ہو۔

اگر کوئی یہ خیال کرے کہ اسلام نے علمائے دین کے لیے ایک مخصوص لباس وضع کیا ہے اور کہا ہے کہ کیونکہ آپ عالم دین ہیں' اس لیے آپ کا ایک مخصوص لباس ہونا چاہیے' جو آپ کو غیر عالم افراد سے ممتاز کرے' تو ایسا نہیں ہے۔ ہمارے یہاں دین میں اس قسم کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس اخبار و احادیث میں' لباس پہننے' کیسا لباس پہنا جائے اور لباس پہننے کے آداب

مستحبات کا باب موجود ہے' لیکن اُس میں کوئی بات علما سے مختص نہیں ہے۔ اگر کوئی لباس کسی خصوصی کیفیت کی وجہ سے مستحب ہے' تو جس طرح وہ عالم کے لیے مستحب ہے' اُسی طرح غیر عالم کے لیے بھی مستحب ہے' اور اگر مکروہ ہو' تو جس طرح علما کے لیے مکروہ ہے' اُسی طرح غیر علما کے لیے بھی مکروہ ہے۔

مزید وہ کام جو اسلام نے علمائے دین کے بارے میں نہیں کیے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے قانون میں عالم دین کے لیے کسی امتیاز اور استثنا کا قائل نہیں رہا ہے۔ مثلاً اُس نے یہ نہیں کہا ہے کہ جہلا چار رکعت نماز پڑھیں اور علما دو رکعت۔ اگر آپ کے پاس مال و دولت آ جائے تو آپ زکات دیجیے اور علما نہ دیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسا مال ہو جس پر خمس بنتا ہو تو آپ خمس دیں اور علما نہ دیں۔ ہاں' دوسرے ادیان میں ایسا تھا' مثلاً برہمنوں اور زردشتیوں کے دین میں' برہمن اور موبد {زردشتیوں کے دینی پیشوا} پر مالیات کی ادائیگی معاف تھی' لیکن اسلام نے نہ تو عمومی قوانین اور نہ ہی سزاؤں میں عالم اور غیر عالم کے درمیان کوئی فرق رکھا ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا ہے کہ اگر عالم فلاں گناہ کا مرتکب ہو' تو اُسکی سزا غیر عالم کی سزا سے کم ہوگی۔ حتیٰ اُخروی سزاؤں میں تو {اسلام} عالم کو زیادہ سزا کا مستحق قرار دیتا ہے' البتہ دنیا میں کوئی فرق نہیں۔

{اسلام نے} فہم' تفسیر اور تخصص (specialization) کا حق بھی ایک معین طبقے میں منحصر نہیں رکھا ہے' بلکہ علم اور فنی صلاحیت کو اسکی شرط قرار دیا ہے۔ بہت سے ادیان میں آپ پیدائش' موت' شادی بیاہ کے مواقع اور عبادت خانوں میں کچھ خاص قسم کی رسوم کا مشاہدہ کرتے ہیں' جو اُن کے مذہبی پیشواؤں سے مخصوص ہوتی ہیں۔ بالفرض نومولود کے کان میں دعا پڑھنے والے شخص کو مثلاً کاہن ہی ہونا چاہیے' روحانی پیشوا ہی ہونا چاہیے' یا نام رکھنے والے شخص کو روحانی پیشوا ہونا چاہیے' مردے کے لیے دعا کرنے والے یا نماز میت پڑھانے والے کو عالم ہونا چاہیے۔ اسلام کہتا ہے کہ ہر کوئی نماز میت پڑھا سکتا ہے۔ بچے کے کان میں پڑھی جانے والی مستحب دعا کوئی بھی پڑھا سکتا ہے' اسی طرح جانوروں کو بھی کوئی بھی ذبح کر سکتا ہے۔ مثلاً یہود کہتے ہیں کہ مرغ یا حیوان کو کاٹنے کے لیے حتماً خاخام {یہودی روحانی پیشوا} کو آنا چاہیے۔ اسلام

کبھی بھی افراد کے لیے اس امتیاز کا قائل نہیں رہا ہے۔ البتہ اسلام ذبیحے کے لیے شرائط کا قائل ہے' مثلاً کہا ہے کہ قبلہ رُخ کر کے ذبح کرنا چاہیے' اس موقع پر خدا کا نام لینا چاہیے' ذبح کرنے والا مسلمان ہونا چاہیے۔ یہ بھی کہا ہے کہ {ذبح کے لیے مسلمان ہونے کی} اس شرط کی وجہ صرف اسکے مسلمان ہونے کی بنا پر نہیں ہے' بلکہ کیونکہ غیر مسلم ان احکام پر عمل نہیں کر سکے گا' اس لیے اسے ذبح نہیں کرنا چاہیے۔ بعض فقہا کی رائے میں اگر کوئی غیر مسلم بھی ان احکام پر عمل کر سکے تو {اسکے بھی ذبح کرنے میں} مضائقہ نہیں۔ لیکن اسلام یہ نہیں کہتا کہ صرف علمائے دین گائے یا مرغ ذبح کرنے کا حق رکھتے ہیں' اور اگر ان کے علاوہ کسی اور نے ذبح کیا تو قبول نہیں کیا جائے گا' حرام ہوگا۔ اسلام میں ایسی کوئی بات نہیں۔

جماعت کی امامت

اگر آج لوگ کچھ خاص {دینی} مراسم میں علما سے رجوع کرتے ہیں' تو اسکی وجہ یہ ہے کی یہ خود لوگوں کی خواہش ہوتی ہے' کیونکہ وہ علما پر زیادہ اعتماد رکھتے ہیں' ایسا اُن سے اسلام نے نہیں کہا ہے۔ مثلاً جماعت کی امامت۔ کیا اسلام نے کہا ہے کہ امامِ جماعت علما میں سے ہونا چاہیے؟ نہیں' اُس نے کہا ہے کہ عادل ہونا چاہیے' لیکن لوگوں کو کیونکہ علما کی عدالت پر زیادہ اعتماد ہوتا ہے' اس لیے بہت کم ہی وہ جماعت کی امامت کے لیے کسی غیر عالم کا انتخاب کرتے ہیں۔ امامِ جماعت انسانی فضائل: تقویٰ' علم' سیادت' حتیٰ بسا اوقات خوبصورتی اور زیبائی کے اعتبار سے' اور ہر اُس چیز کے لحاظ سے جو انسان کے لیے خوبی شمار ہوتی ہے' جتنے زیادہ فضائل کا مالک ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ اسکے باوجود بہرحال یہ صرف علما سے اختصاص رکھنے والا ایک فریضہ نہیں ہے۔

استخارہ

کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں لوگوں نے علما کے لیے مقرر کر دیا ہے' جیسے استخارہ۔ بعض لوگوں کو تو خود استخارہ کرنے ہی میں تامل ہے' چہ جائیکہ اسے لازماً علما ہی کو کرنا چاہیے' اور یہ ہے بھی کیسی مصیبت: انسان گھر میں بیٹھا مطالعے یا لکھنے میں مصروف ہے' ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے' اور

دوسری طرف موجود شخص کہتا ہے کہ جناب! معذرت چاہتا ہوں ذرا ایک استخارہ دیکھ دیجیے۔ وہ چیز جو خود مجھے بہت ناگوار گزرتی ہے' وہ یہ ہے کہ کسی گلی یا سڑک سے گزر رہا ہوں' اور میری عادت ہے کہ میں تیز قدموں سے چلتا ہوں اور ایک بُری عادت یہ بھی ہے کہ میرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے اور میں اُسے بے وجہ گھما رہا ہوتا ہوں' جوں ہی لوگوں کی نگاہ تسبیح پر پڑتی ہے' اُنہیں استخارے کا خیال آ جاتا ہے اور یکلخت وہ راستہ روک کے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جناب ایک استخارہ دیکھ دیجیے۔ یہ اُن چیزوں میں سے ہے جو خود ہم لوگوں نے بنا ڈالی ہیں۔ البتہ میں خود استخارہ کرتا ہوں' اس کا مخالف نہیں ہوں' لیکن بہتر یہ ہے کہ ہر انسان خود ہی استخارہ کرے۔ حتیٰ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک شخص کا دوسرے شخص کے لیے استخارہ دیکھنا درست نہیں ہے' اور ہر شخص کو اپنا استخارہ خود دیکھنا چاہیے' نہ یہ کہ علما کا ایک فریضہ استخارہ دیکھنا ہے۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بہر حال اس بات کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

انہی چیزوں میں سے ایک چیز ختم {موت کے موقع پر قرآن خوانی} کا مسئلہ ہے۔ اس کا ایک ایسی ذمے داری کے عنوان سے جسے لازماً ایک عالمِ دین کو انجام دینا چاہیے علما کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

ہمیں ان باتوں کو جاننا چاہیے' اور اسکے مقابل یہ بھی جاننا چاہیے کہ اسلام نے عالم سے کچھ مثبت ذمے داریوں کا تقاضا کیا ہے۔ علمائے دین کے مقابل ہماری بھی کچھ ذمے داریاں ہیں' جنہیں ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ ہمیں نہیں پتا کہ اسلام کے بارے میں ایک عالمِ دین کے کیا فرائض ہیں' اگر ہم اُن سے واقف ہوتے تو حقیقی اور واقعی علما اور دوسروں میں تمیز کرتے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ علما کے حوالے سے خود ہمارے کیا فرائض ہیں۔ اسکے برخلاف ہم نے اپنی طرف سے کچھ باتیں اور مسائل گھڑ لیے ہیں جن کی وجہ سے بسا اوقات عجیب مشکلات جنم لیتی ہیں۔

میرزا قمی کے شاہنامہ پڑھنے کا واقعہ

میرزا قمی کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے۔ آپ وحید بہبہانی کے شاگرد تھے' جو ایک

عظیم عالم' ممتاز بزرگ' اور بہت سے بڑے بڑے مجتہدین کے استاد تھے۔ میرزا قمی جن کا تعلق شمالی ایران سے تھا' کربلا میں اپنے استاد وحید بہبہانی کے محضرِ درس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس آئے۔ لوگوں کی زبانوں پر آپ کی واپسی کا چرچا تھا' لیکن دیہاتی لوگوں نے {اُن کے فریضے اور ذمے داری کو} بالکل نہیں پہچانا۔ بہرحال ایک رات انہیں ایک محفل میں مدعو کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اب جبکہ جناب عالی ایک بڑے عالم بن چکے ہیں تو آئیں اور اپنا فریضہ انجام دیں۔ جب وہ تشریف لائے اور وہاں بیٹھ گئے' تو لوگ ایک شاہنامہ لے کر آئے اور اسے اُن کے سامنے رکھ دیا اور کہنے لگے کہ ہمارے لیے تھوڑا سا شاہنامہ پڑھ دیں۔ انہوں نے اپنی ساری عمر میں کبھی شاہنامہ نہیں پڑھا تھا۔ بہرکیف انہوں نے اسے قدرے آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کیا۔ وہ لوگ جھنجلاہٹ سے اپنے سروں کو جھٹکنے لگے اور کہنے لگے کہ افسوس انہوں نے اتنے سال اور کتنا پیسا اپنی تعلیم پر برباد کیا' جاؤ اور فلاں ملّا کو بلا کر لاؤ۔ وہ ملّا آتا ہے' اپنا دامن سمیٹ کر' تلوار ہاتھ میں پکڑ کر بالکل اسی انداز سے شاہنامہ پڑھتا ہے جیسے اسے قہوہ خانوں میں پڑھا جاتا ہے' اور لوگ میرزا سے کہتے ہیں کہ دیکھئے ایسے شاہنامہ پڑھتے ہیں' پس آپ نے وہاں کیا پڑھا ہے؟!

ایران کے ایک شہر میں' جہاں ایک سال میرا جانا ہوا تھا' میں ایک سڑک عبور کر رہا تھا کہ وہیں سڑک کے بیچوں بیچ ایک شخص نے میرا راستہ روک لیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ جناب! غسلِ جنابت کا تعلق جسم سے ہے یا روح سے؟ میں نے اُس سے کہا کہ "غسلِ جنابت کا تعلق جسم سے ہے یا روح سے؟!!" یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی' اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ غسلِ جنابت کی ایک نیت ہوتی ہے' جو روح سے تعلق رکھتی ہے' اور اسکے بعد اسکی ایک ترتیب ہوتی ہے کہ جس میں پہلے سر اور گردن اسکے بعد دائیں جانب اور پھر بائیں جانب کو دھویا جاتا ہے (اور اس کا تعلق بدن سے ہے)۔ اُس آدمی نے اپنا سر جھٹکا اور بولا: پھر تم نے خوامخواہ یہ عمامہ اپنے سر پر کیوں رکھا ہوا ہے؟

عجیب وغریب سوالات

بعض لوگ علما سے عجیب وغریب مسائل کے جواب طلب کرتے ہیں۔ اتفاقاً یہودی عوام بھی پیغمبر کے پاس جا کر اسی قسم کے سوالات کیا کرتے تھے۔ مثلاً پوچھتے تھے کہ بتایئے وہ کونسا وقت ہے جو نہ دن کا حصہ ہے اور نہ رات کا؟ کہتے ہیں کہ بین الطلوعین۔ کبھی بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا بات ہے جسے اگر نماز میں بولا جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے اور اگر نہ بولا جائے تب بھی باطل ہو جاتی ہے؟ کہتے ہیں کہ وہ نیت ہے کہ اگر (نماز کی حالت میں) زبان پر لے آؤ' تو نماز باطل ہو جاتی ہے اور اگر نیت نہ کرو تو نماز باطل ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ہمارے بچپنے میں ایک صاحب تھے جو ایسے بہت سے عجیب وغریب سوالات کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب کوئی بھی نہ دے سکا۔ انہوں نے پوچھا کہ بتاؤ وہ کونسی نماز ہے جو گدھے کی آواز سننے سے باطل ہو جاتی ہے؟ کوئی اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ آخر کار خود انہوں نے جواب دیا: فرض کیجیے آپ ایک مرتبہ جنگل میں گدھے پر سفر کر رہے ہیں' اور گدھے پر رکھے ہوئے سامان میں پانی بھی ہے' یہ گدھا گم ہو جاتا ہے اور پوری کوشش کے باوجود آپ اسے ڈھونڈ نہیں پاتے' پانی کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں' مجبوراً نماز کے لیے تیمم کرتے ہیں' اور جوں ہی آپ نماز شروع کرتے ہیں' گدھے کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ وہ موقع ہے جب آپ کی نماز باطل ہو جاتی ہے' آپ کو چاہیے کہ آپ وضو کر کے نماز پڑھیں۔ پس یہ وہ نماز ہے جو گدھے کی آواز سننے سے باطل ہو جاتی ہے۔

یہ انحراف اور گمراہی کی باتیں ہیں۔ دین مقدس اسلام نے پاک و پاکیزہ علما کے بارے میں کس قدر گفتگو کی ہے۔ {اس نے} سب سے پہلے عالم سے جس چیز کا تقاضا کیا ہے' وہ تقویٰ ہے (ہم نے جس خطبے کو {ابتدا} میں پڑھا تھا' وہ یہ باتیں بیان کرتا ہے)' صفا ہے' معنویت ہے' نفسانی خواہشات کے خلاف جنگ ہے: "قَدْ خَلَعَ سَرَابِيلَ الشَّهَوَاتِ." اُس نے اپنے بدن سے خواہشاتِ نفسانی کے لباس کو جدا کر دیا ہے۔ یہ عالمِ دین کی وہ صفات ہیں جن کا ذکر امیر المومنین کر رہے ہیں' اُس شخص کی صفات بیان فرما رہے ہیں جو اُن بالاترین دینی مناصب پر

فائز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: قَدْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلّٰهِ (سُبْحَانَهُ) فِي اَرْفَعِ الْاُمُورِ مِنْ اِصْدَارِ كُلِّ وَارِدٍ عَلَيْهِ وَتَصْيِيرِ كُلِّ فَرْعٍ اِلٰى اَصْلِهِ. ایسا ہی شخص اظہارِ نظر کا حق رکھتا ہے۔

یہ خطبہ عالم کے بارے میں ہے، اسکے لیے ہمارے پاس ایک اور قرینہ بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اسکے بعد امامؑ نے اسکے نقطۂ مقابل علمائے سو کا ذکر کیا ہے: وَ آخَرُ قَدْ تَسَمّٰى عَالِماً وَلَيْسَ بِهِ. یعنی ایک اور شخص بھی ہے کہ جو فقط نام کا عالم ہے، خود ہی اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہے، لیکن اسلام اُسے عالم قرار نہیں دیتا۔

وہ کون ہے؟

آپ نے اسکی بھی کچھ صفات ذکر فرمائی ہیں، انشاء اللہ انہیں شاید آئندہ مجلس میں ہم آپ کی خدمت میں عرض کریں گے۔

❁❁❁

ساتواں خطاب

غیر صاحبِ شریعت انبیاؑ کے جانشین علما کی صفات

ساتواں خطاب

غیر صاحبِ شریعت انبیا کے جانشین علما کی صفات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.... اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

"وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ."(۱)

مسئلۂ خاتمیت کے بارے میں ہماری گفتگو اس مرحلے میں تھی جس کا تعلق علمائے دین سے ہے' اور اس بارے میں تھی کہ خاتمیت کے ستونوں میں سے کونسا ستون اور اسکے ارکان میں سے کونسا رکن ہے جو علمائے دین سے تعلق رکھتا ہے۔ گزشتہ جلسے میں ہماری گفتگو اس موضوع کی وضاحت میں تھی کہ دین مقدسِ اسلام نے علما کے بارے میں کیا نقطۂ نظر پیش کیا ہے' اور اُن کے بارے میں کیا احکام دیے ہیں اور علما کے اور پھر علما کے حوالے سے لوگوں کے کیا فرائض وضع کیے ہیں۔ اسلام کا یہ قانون بھی' یعنی جو کچھ اسلام نے اس بارے میں معین کیا ہے وہ ہو بہو اسکے دوسرے موضوعات کی مانند انتہائی دلکش' منطقی' تکلف سے عاری اور عقل پسند ہے۔ یہ قانون خود اپنی جگہ دین مقدسِ اسلام کے حکمت و دانائی پر مبنی ہونے کی ایک علامت ہے۔

۱۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۲۲

علمائے دین کے بارے میں اسلام نے جن امور کی نفی کی ہے ہم نے گزشتہ جلسے کی عرائض میں انہیں بیان کیا تھا۔ اسلام عبادات کے باب میں کاہن یا روحانی کے نام سے کسی ایک خاص طبقے کا قائل نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ وہ ولادت یا اموات یا ذبح سے تعلق رکھنے والے مراسم میں اُن کے حوالے سے کسی لازمی شرط کا قائل ہو' جیسا کہ ادیانِ عالم ان مواقع پر عالمِ دین کے لیے ایک خاص کردار کے قائل ہیں۔ اسی طرح عام طور پر تمام ادیان اس شخص اور عمل کے درمیان ایک خاص مرموز تعلق کے قائل ہیں۔ مثلاً {یہودیوں کے یہاں} اگر خاخام {یہودی روحانی پیشوا} کے ہاتھ سے ذبح ہو تو درست ہوگا اور اگر کوئی دوسرا ذبح کرے' تو درست نہیں ہوگا۔ اسی طرح کی اور باتیں بھی ہیں جن پر ہم گفتگو کرنا نہیں چاہتے۔ صرف ایک موضوع' جسے ہم گزشتہ ہفتے عرض کرنا بھول گئے تھے' عرض کرتے ہیں اور اسکے بعد {علما کے حوالے سے} اسلام کے مثبت قوانین کا بیان شروع کریں گے۔

علما کی معاش کا مسئلہ

آپ دیکھئے کہ یہ دین کس قدر عالی' ترقی پذیر' منطقی' عقل پسند اور حکیمانہ ہے۔ اہلِ علم کی معاش کے مسئلے میں بھی اسلام نے کوئی خصوصی حکم نہیں دیا ہے۔ یعنی اسلام نے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ لوگ جو عالمِ دین ہیں' کیونکہ عالمِ دین ہیں اس لیے ایک عمومی فریضے اور تمام افرادِ معاشرہ پر عائد ہونے والے ایک واجب' یعنی ''حصولِ معاش کے لیے جدوجہد'' سے اُنہیں معاف رکھا گیا ہے۔

یہ خود ایک مسئلہ ہے کہ اوّلاً اسلام میں ہر کسی پر واجب ہے کہ وہ اپنی معاش اور گزر بسر کے لیے کام کرے۔ اسکے برعکس نقطہ دوسروں پر بوجھ بننا ہے۔ ''وسائل'' اور اسکے علاوہ دیگر کتب میں بھی ایک حدیثِ نبویؐ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: مَلْعُونٌ مَنْ اَلْقٰی کَلَّهُ عَلَی النَّاسِ. (۱) ملعون ہے ایسا شخص جو اپنا بوجھ دوسروں کے کاندھوں پر ڈال دے۔ عجیب تشبیہ ہے۔ ہر انسان ایک جسامت کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس کا جسم ایک وزن رکھتا ہے۔ اسی جسم میں عضلات اور

۱۔ فروع کافی۔ ج ۵۔ ص ۷۲

عضلاتی قوتیں ہوتی ہیں جو اس جسم کو روئے زمین پر رواں دواں رکھتی ہیں' ہر انسان کا ایک بوجھ ہوتا ہے' اور خداوندِ عالم نے اسے ایک ایسی طاقت دی ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے بدن کو حرکت دیتا ہے۔ ہم میں سے ہر انسان جو روئے زمین پر چلتا پھرتا ہے' اُس کا ایک وزن ہوتا ہے' اور اسکے مقابل ایک طاقت بھی ہمارے پاس ہوتی ہے جس کے ذریعے ہم اپنے بدن کو اٹھاتے ہیں۔ جو بدن بھی وزن رکھتا ہے' {وہ اس} طاقت کا مالک بھی ہوتا ہے۔ یہ ظاہری وزن اور بوجھ کی بات تھی۔ معاش کا بھی اپنا ایک بوجھ ہوتا ہے' لیکن یہ اقتصادی بوجھ ہوتا ہے۔ خداوندِ عالم نے ہر انسان کو کسب وکار کے لیے ایک طاقت سے نوازا ہے۔ پیغمبر فرماتے ہیں: ہر شخص کا اقتصادی بوجھ' خود اسکی اقتصادی قوت کو اٹھانا چاہیے: مَلْعُونٌ مَنْ اَلْقیٰ کَلَّهُ عَلَی النَّاسِ. یہ دین اسلام اور ہماری فقہ کے مسلّمات میں سے ہے' اس پہلو سے اسلام میں کوئی استثنا نہیں پایا جاتا۔

ہاں' ایک اور چیز بھی ہے' اور وہ فقہا کی اصطلاح میں قاعدۂ باب تزاحم ہے۔ کبھی انسان کی ایک ذمے داری ہوتی ہے' اور عین اسی وقت اس پر ایک اور ذمے داری بھی عائد ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر اسکے پاس ان دو ذمے داریوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے ایک خاص سبب کی بنا پر بہت سے افراد پر ایک ذمے داری عائد ہوتی ہو' اور جب وہ اس ذمے داری کی انجام دہی میں مشغول ہوں' تو وہ ذمے داری جسے کسب وکار اور معاش کا بندوبست کہا جاتا ہے اسے انجام نہ دے سکتے ہوں۔ اسلام قانونِ تزاحم کی رو سے (قانونِ استثنا کی رو سے نہیں) کہتا ہے کہ کیونکہ تم نے ایک زیادہ اہم کام انجام دینا ہے' اور تمہارے سوا کوئی اور نہیں {جو یہ کام انجام دے سکے} لہٰذا تم فی الحال اس ذمے داری سے بری ہو۔

شیخ انصاری اعلی اللہ مقامہ نے اپنی کتاب ''مکاسب'' میں حصۂ اوّل کے اواخر میں یا پہلی جلد میں خیارات سے پہلے اس موضوع پر ایک گفتگو کی ہے' اس بارے میں {گفتگو فرمائی ہے} کہ کیا طلاب اور علمائے دین کو {حصولِ معاش کے لیے} کام کاج کرنا چاہیے یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں کوئی استثنا نہیں ہے' کسب وکار علما اور طلاب دینی سمیت تمام لوگوں پر واجب ہے۔ البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک یا ایک سے زیادہ افراد پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہی دینی تعلیم

وتربیت کا فریضہ انجام دیں اور دوسرا کوئی کام نہ کریں۔

وہ کہتے ہیں کہ {حصولِ معاش کے لیے} کام کاج ایک واجبِ عینی ہے' اور دوسری طرف ایک واجبِ کفائی بھی موجود ہے' جسے ''تفقہ'' کہا جاتا ہے۔ تمام لوگوں پر واجبِ کفائی ہے کہ اُن میں سے کچھ لوگ دین میں فقیہ {بنیں} 'یعنی کچھ دین شناس' کچھ اسلام شناس لوگ اُن کے درمیان موجود ہوں' جو اسلام کے اصولِ عقائد کو جانتے ہوں' دوسروں کو ان کی تعلیم دے سکتے ہوں' ان کا دفاع کر سکتے ہوں' اسلام کی اخلاقی اور اجتماعی تعلیمات کو اُن کی جامعیت کے ساتھ لوگوں کو سکھا سکتے ہوں۔ یہ ایک واجبِ کفائی ہے' تمام لوگوں کی یہ ذمے داری ہے کہ لازماً اُن کے درمیان دین میں سوجھ بوجھ اور بصیرت رکھنے والے کچھ لوگ موجود ہوں۔

یہاں دو قسم کے واجب ہیں' ایک عینی اور ایک کفائی۔ ''مَن بِهِ الكفاية'' (۱)' موجود ہے' اُس وقت کہا جاتا ہے کہ مثلاً میں دیکھتا ہوں کہ میں جو فلاں مذہبی کام انجام دے رہا ہوں' معاشرے میں مجھ سے بہتر سو ایسے افراد موجود ہیں کہ اگر میں اس کام سے کنارہ کش ہو بھی جاؤں' تب بھی {اس کام کے سلسلے میں} معاشرے کی ضرورت پوری ہوتی رہے گی۔ اس صورت میں مجھ پر واجب ہے کہ پہلے درجے میں' میں {حصولِ معاش کے لیے} کام کاج کا رُخ کروں' اور اگر اضافی وقت موجود ہو' تو وہ مذہبی کام انجام دوں۔

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے جب ''مَن بِهِ الكفاية'' نہیں پایا جاتا' اور اگر یہ ایک فرد پیچھے ہٹ جائے تو اسکی چھوڑی ہوئی جگہ خالی رہ جائے گی' ایسے موقع پر نہ صرف ''مَن بِهِ الكفاية'' نہیں پایا جاتا' بلکہ ''مَن بِهِ الكفاية'' سے بھی انتہائی کم تر صورتحال ہوتی ہے۔ اگر فلاں صاحب کہیں کہ میں اگر اجتہاد کی طرف نہ گیا' تو اس شعبے میں کوئی اور نہیں ہے' اور بقدرِ کفایت {مجتہد} موجود نہیں' یہاں اُن پر ایک واجبِ کفائی عائد ہوتا تھا' لیکن کیونکہ ''مَن بِهِ الكفاية'' موجود نہیں اس لیے وہ واجبِ عینی بن جاتا ہے۔ یہاں ایک اور واجبِ عینی موجود ہے' جو {حصولِ معاش کے

۱۔ یعنی ایک یا ایک سے زیادہ ایسے اشخاص جن کا یہ عمل انجام دینا ضرورت کے لیے کافی ہو۔ (مترجم)

سلسلے میں} کام کاج کرتا ہے' لیکن کیونکہ واجب کفائی کا وہ موضوع انتہائی اہمیت کا حامل ہے' اور "مَن بِهِ الكفاية" بھی نہیں ہے' لہٰذا قانونِ تزاحم کے تحت (حکمِ استثنا کے تحت نہیں) اسلام ایک شخص کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنا وقت اور عمر دینی امور کے لیے صرف کرے' اور اسکی زندگی کے مصارف بیت المالِ مسلمین سے پورے کیے جائیں۔

پس دیکھئے جیسا کہ ہم نے عرض کیا' اسلام مالیات (Taxation) میں کسی استثنا کا قائل نہیں' اور یہ نہیں کہتا کہ خمس وزکات علمائے دین کے سوا تمام لوگوں پر عائد ہوتے ہیں' اسی طرح وہ حصولِ معاش کے لیے کوششوں میں بھی کسی استثنا کا قائل نہیں ہے۔ بعض مغربی ممالک میں ایک قانون ہے' جسے لوگ بہت احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں' لیکن میں اُن کے اس احترام کو درست نہیں سمجھتا۔ کہتے ہیں کہ وہاں مذہبی مبلغین کو ایک قانونی استثنا حاصل ہے' ان لوگوں کو بعض ٹیکسوں کی چھوٹ دی گئی ہے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اسلام میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے کہ اس قانون میں شروع ہی سے استثنا پایا جاتا ہو' نہ مالیات کے لحاظ سے اور نہ ہی کام کاج کرنے کے اعتبار سے۔

ہاں' ایک طرح کے خصوصی حالات میں (یہ خصوصی حالات اس آیت میں بیان کیے گئے ہیں: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً....) اسلام اُن باصلاحیت افراد سے' (جو یہ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں' اور اگر وہ کنارہ کش ہو جائیں' تو "مَن بِهِ الكفاية" کا وجود نہ ہوگا' اور اس حکم کی انجام دہی میں لازماً ایک خلل واقع ہو جائے گا) کہتا ہے کہ فی الحال اور عارضی طور پر آپ کو اس حکم سے چھوٹ حاصل ہے۔

خود انہی عظیم شخصیت یعنی شیخ انصاریؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب آپ نجف میں تھے' تو آدھے دن بازار میں لین دین کے ایک ادارے میں کام کیا کرتے تھے اور دن کے دوسرے نصف حصے میں اپنے استاد مرحوم شریف العلما مازندرانی کے درس میں شرکت کرتے تھے (اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے معاملات کے بارے میں اپنی کتاب "مکاسب" کو جو اس خوبی کے ساتھ لکھا ہے' تو اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ خود مدتوں بازار میں رہے تھے اور اُن کا ذاتی طور پر بازار کے کاموں سے

سرو کار رہا تھا) یہاں تک کہ اُن کے استاد شریف العلما نے انہیں بازار میں کام کرنے سے منع کیا' اُن پر پابندی لگادی اور اُن سے کہا کہ آپ اُن افراد میں سے ہیں جنہیں اپنا پورا وقت دینی امور کے لیے مختص کر دینا چاہیے۔ انہوں نے صحیح ہی کہا تھا۔ پس دیکھئے اسلام کہاں تک آگے گیا ہے۔ یہ تھے {علمائے دین کے بارے میں اسلام کے} وہ احکام جن میں انہیں مختلف کاموں سے روکا گیا ہے۔

علمائے دین کے بارے میں اسلام کے مثبت احکام

آیئے مثبت احکام کی طرف آتے ہیں۔ اسلام عالمِ دین سے کیا چاہتا ہے؟ البتہ اسلام پہلے درجے میں عالمِ دین سے علم' تفقہ' بصیرت اور دانش چاہتا ہے۔ اس بارے میں ہم آگے وضاحت کریں گے۔

ایک اور چیز ہے جس کی جانب شاید بعض لوگوں نے توجہ نہ دی ہو' اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے عالمِ دین سے' لوگوں کے دینی امور کے مرجع سے' اصطلاحاً مفتی سے' جو لوگوں کے لیے فتویٰ دیتا ہے' تقویٰ کا تقاضا کیا ہے۔ اور وہ بھی ایک معمولی حد کی عدالت تک کا تقویٰ نہیں' بلکہ اس معمولی حد کی عدالت سے بڑھ کر۔ ہمیں اس بات کو ایک دو موازنوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہیے' تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

ہمارے یہاں علمائے دین کے اصطلاحاً دو طبقے ہیں' ایک طبقہ راویان و ناقلانِ حدیث کا ہے۔ راوی وہ ہے جو نقل کرتا ہے لیکن استنباط نہیں کرتا' اپنی رائے نہیں دیتا' وہ کہتا ہے کہ میں نے فلاں سے سنا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ میں نے فلاں سے سنا ہے' یہاں تک کہ یہ سلسلہ مثلاً امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہنچتا ہے کہ آنجنابؑ نے فلاں بات ارشاد فرمائی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ راوی کی شرط کیا ہے اور کیا ہم ہر راوی کی بات قبول کر سکتے ہیں؟ نہیں' اگر راوی ثقہ ہو' یعنی نقل کرنے میں راست گو اور قابلِ اطمینان ہو۔ اگر ہم یہ جانتے ہوں کہ ایک آدمی ہے جس میں کم از کم یہ فضیلت موجود ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا' ہم اُس سے حدیث قبول کر سکتے ہیں' البتہ اس شرط کے ساتھ کہ ہمیں علم ہو کہ واقعاً وہ ایک ثقہ شخص ہے۔ ممکن ہے ایک شخص مثلاً بعض مذہبی فرائض میں

ست ہو' لیکن ایک سو فیصد سچا آدمی ہو۔ کوئی اس سے زیادہ شرط نہیں رکھتا' ہم راوی اور ناقل کے لیے اس سے زیادہ کسی شرط کے قائل نہیں ہیں' اور اس سے زیادہ کا قائل ہونا ضروری بھی نہیں ہے۔ جب امامؑ سے بھی پوچھا جاتا ہے کہ: اَفَیونُسُ بْنُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ثِقَةٌ آخُذُعَنْهُ مَعالِمَ دینی؟ کیا یونس بن عبدالرحمٰن قابلِ اعتماد فرد ہے؟ امامؑ فرماتے ہیں: ہاں ہاں قابلِ اعتماد ہے۔

لیکن کیا ایک مفتی' یعنی صاحبِ رائے' دین میں بصیرت اور سوجھ بوجھ رکھنے والے فرد کے لیے فقط ثقہ اور راست گو ہونا کافی ہے؟ نہیں' کافی نہیں ہے۔ اگر ایک شخص درجۂ اجتہاد پر فائز ہو اور علمی لحاظ سے بھی دوسرے تمام لوگوں سے برتر ہو' راست گو بھی ہو' کسی صورت جھوٹ نہ بولتا ہو' لیکن بعض دوسرے گناہوں مثلاً غیبت کرنے سے اجتناب نہ کرتا ہو' حسادت سے پرہیز نہ کرتا ہو' طبیعتاً حاسد ہو اور اسی باطنی حسادت پر مبنی ایک عمل انجام دیتا ہو' ایک ایسا گناہ انجام دیتا ہو جو نقل میں ثقہ ہونے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ کیا ایسے شخص کی تقلید کی جاسکتی ہے؟ نہیں' ہرگز نہیں کی جاسکتی' باوجود یہ کہ آپ پڑھتے ہیں کہ کہا جاتا ہے: جناب! مجتہد کے لیے تو اس قدر شرائط کی ضرورت نہیں' مجتہد یعنی ماہرِ فن (specialist)' عام طور پر لوگ کسی فن کے ماہر کے لیے علمی مہارت' تجربے اور اسکی راست گوئی سے زیادہ کسی اور شرط کے قائل نہیں ہوتے۔ مثلاً ہمارے یہاں عمارت اور فرش کے ماہر ہوتے ہیں' ہم ایک ایسے ماہر کے پاس جاتے ہیں جو علم رکھتا ہو' بصیرت کا مالک ہو' دھوکا باز بھی نہ ہو اور جب کوئی رائے دے تو اس میں کوئی چال نہ چلے' اب اگر یہ ماہر اپنے گھر میں شراب پیتا ہو' یا کسی اور گناہ کا مرتکب ہوتا ہو تو اس {کے ان افعال} سے ہمیں کیا سروکار؟!

لیکن عالمِ دین اور مجتہد کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

کیا وہ محض ایک ماہر ہے' اور اُس میں بس ایک ماہر کی شرائط پائی جانی چاہئیں۔ یعنی بس اسے اس کام کے لیے علم اور فن کا مالک ہونا چاہیے' اور اپنے کام میں بھی جھوٹ اور دھوکے سے کام نہ لینے والا ہونا چاہیے۔ کیا بس یہی کافی ہے؟ نہیں۔ بنیادی طور پر اُسے ہر گناہ سے پرہیز کرنا چاہیے' اسے عادل ہونا چاہیے' عام افراد کی عدالت سے بڑھ کر عادل' وہ جملہ جو امامؑ نے فرمایا

ہے: اَمَّامَنْ کَانَ مِنَ الْفُقَھَاءِ صَائِناً لِنَفْسِہِ حَافِظاً لِدِیْنِہِ 'مُخَالِفاً عَلیٰ ھَوَاہُ 'مُطِیْعاً لِاَمْرِ مَوْلاہُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ یُقَلِّدُوہُ' (۱) خود مجتہدین کہتے ہیں کہ اس جملے سے جو بات سمجھ آتی ہے وہ عدالت سے بڑھ کر ہے۔ اس مجتہد اور مرجع کو' اسے جو امیر المومنین کی تعبیر کے مطابق اپنے آپ کو بلند ترین مقام پر قرار دیتا ہے' جس سے لوگ رجوع کرتے ہیں' ایسا شخص جو فروع کو اصول پر منطبق کرنا چاہتا ہے' اسے عدالت سے بڑھ کر صلاحیت کا مالک ہونا چاہیے۔ ہم نہیں کہتے کہ وحی اور الہام{ کا حامل ہو} 'لیکن اُسے ایک عام عالم کی حد سے بڑھ کر صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہیے' ایک صفا' معنویت اور نورانیت کا مالک ہونا چاہیے' کہ یہی نورانیت اُسکی مؤید ہو اور اُسکی تائید کرتی ہو۔ صرف اس کا فکری لحاظ سے مضبوط ہونا کافی نہیں ہے' اُسے روحانی اور معنوی لحاظ سے بھی مضبوط ہونا چاہیے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: اِنَّا لاَ نَعُدُّ الْفَقِیْہَ مِنْکُمْ فَقِیْھاً حَتّیٰ یَکُوْنَ مُحَدَّثاً ۔ آپ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: میں تمہارے فقہا میں سے کسی کو فقیہ شمار نہیں کرتا جب تک کہ وہ محدث نہ ہو۔ یعنی اسکے باطن کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہو' اسے خبر دی جاتی ہو' اس پر کچھ چیزوں کو الہام کیا جاتا اور اسے تلقین کی جاتی ہو۔ راوی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: اَوَیَکُوْنُ الْفَقِیْہُ مُحَدَّثاً؟! کیا فقیہ بھی محدث ہو سکتا ہے؟! محدث ہونا تو انبیا و ائمہ کا رُتبہ ہے۔ امام نے فرمایا: یَکُوْنُ مُفَھَّماً 'وَالْمُفَھَّمُ مُحَدَّثٌ ۔ (۲) اُسکے لیے تفہیم ہو جاتی ہے' اُسکی روح کے سامنے دروازے کھل جاتے ہیں' اُسکے باطن کو ایک سعہ صدر اور نورانیت عطا کردی جاتی ہے' یہ ہے محدث ہونا۔ ہاں انہیں اس طرح ہونا چاہیے۔

گزشتہ ہفتے ہم نے امیر المومنین علی علیہ السلام کا ایک جملہ نقل کیا تھا' اور عرض کیا تھا کہ اگرچہ کسی نے اس خطبے کو اُن خطبوں میں شمار نہیں کیا ہے جن میں علمائے دین کے اوصاف بیان

۱۔ احتجاج طبرسی۔ ج ۲۔ ص ۲۶۳ {فقہا میں سے جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو' اپنے دین کی حفاظت کرتا ہو' جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو کچلا ہوا ہو اور جو احکام الٰہی کا مطیع و فرمانبردار ہو' لوگوں کو اسکی تقلید کرنی چاہیے}

۲۔ رجال کشی۔ ج ۲' یہاں منکم کی جگہ منھم (من الشیعہ) آیا ہے۔

کیے گئے ہیں' لیکن جب انسان اس پورے خطبے پر غور کرتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ اگرچہ امیر المومنینؑ نے خطبے کے آغاز میں لفظ عالماً استعمال نہیں کیا ہے لیکن بنیادی طور پر اور کاملاً یہ خطبہ علما کے بارے میں ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں: اِنَّ مِنْ اَحَبِّ عِبادِاللّٰہِ اِلَیْہِ عَبْداً اَعانَہُ اللّٰہُ عَلیٰ نَفْسِہِ. خدا کے نزدیک محبوب ترین بندہ وہ ہے جس کی خدا نے اسکے نفس کے خلاف مدد کی ہو' یعنی خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت کے سلسلے میں اُسکی تائید کی ہو۔

اگر ہم اسکی تائید میں کوئی حدیث پیش کرنا چاہیں' تو ایک حدیث میں ہے کہ جب خداوند عالم کسی بندے کی اسکے نفس کی مخالفت کے سلسلے میں تائید کرنا چاہتا ہے' تو اُسکے قلب میں ایک واعظ اور انتباہ (warn) کرنے والا خلق کر دیتا ہے' یعنی اسکے ضمیر کو زندہ رکھتا ہے' جو ہمیشہ بُرے کاموں پر اسکی سرزنش کرتا رہتا ہے۔

بہت سارے جملے ہیں جو ہم نے اُس ہفتے نقل کیے تھے' لیکن دامنِ وقت کی کوتاہی اُن تمام کا ترجمہ پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہاں تک کہ آپؑ فرماتے ہیں: فَزَهَرَ مِصْبَاحُ الْهُدیٰ فِی قَلْبِهِ' وَاَعَدَّ الْقِریٰ لِیَوْمِهِ النَّازِلِ بِهِ' فَقَرَّبَ عَلیٰ نَفْسِهِ الْبَعِیدَ. وَهَوَّنَ الشَّدِیدَ. نَظَرَ فَاَبْصَرَ. وَذَکَرَ فَاسْتَکْثَرَ.... قَدْ خَلَعَ سَرَابِیلَ الشَّهَوَاتِ. یعنی اسکے دل میں چراغِ ہدایت روشنی بکھیر رہا ہے' اور اس نے اس سخت دن کے لیے جس کا سبھی کو سامنا کرنا ہے توشہ اکٹھا کر لیا ہے' وہ دور کو قریب دیکھ رہا ہے' سخت کو اپنے اوپر آسان کر لیا ہے' اسکی نظریں بصیرت میں اضافے کا موجب ہیں' اسکی یادِ خدا میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔۔۔۔ اُس نے خواہشات کے لباس کو اپنے بدن سے اتار پھینکا ہے. فَخَرَجَ مِنْ صِفَةِ الْعَمیٰ' وَمُشَارَکَةِ اَهْلِ الْهَوَیٰ' وَ صَارَ مِنْ مَفَاتِیحِ اَبْوَابِ الْهُدیٰ' وَمَغَالِیقِ اَبْوَابِ الرَّدیٰ. یعنی وہ اندھے پن اور خواہشاتِ نفسانی کے پجاریوں کی شراکت سے نکل آیا ہے' اور وہاں پہنچ گیا ہے جہاں اس کا شمار ہدایت کے دروازوں کی کلید میں ہونے لگا ہے۔ یعنی اُس نے وہ لیاقت اور قابلیت حاصل کر لی ہے کہ دوسروں کے لیے رہبر اور ہادی بن گیا ہے۔

اسکے بعد والے جملے صریح اور واضح تر ہیں: فَهُوَ مِنَ الْیَقِینِ عَلیٰ مِثْلِ ضَوْءِ

الشَّمْسِ 'قَدْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلّٰہِ(سُبْحَانَهُ) فِی اَرْفَعِ الْاُمُوْرِ 'مِنْ اِصْدَارِ کُلِّ وَارِدٍ عَلَیْهِ' وَتَصْبِیرِ کُلِّ فَرْعٍ اِلیٰ اَصْلِهِ. یہاں مطالب اپنی معراج پر ہیں: یہ آدمی اپنے اندر اس قدر صفا' کمال' معنویت اور روحانی بلندی پیدا کر کے اپنے آپ کو اُن اعلیٰ ترین مناصب پر نصب کر لیتا ہے' یعنی اب اُس میں اُس مسند پر بیٹھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کیا کرتا ہے؟ مِنْ اِصْدَارِ کُلِّ وَارِدٍ عَلَیْهِ' جو چیز اُس میں داخل کی جاتی ہے' اُسے باہر نکالتا ہے' ایک مشین کی مانند جس کی ایک طرف سے اس میں خام مواد ڈالتے ہیں اور دوسری طرف سے وہ تیار شدہ مواد باہر نکالتی ہے۔ اب اُس سے جو بھی سوال کیا جائے وہ اُس کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے' وَتَصْبِیرِ کُلِّ فَرْعٍ اِلیٰ اَصْلِهِ. اب وہ فروع کو اُن کی اصول کی طرف پلٹانے پر قادر ہوتا ہے۔ جو اصول اُسے دیے گئے ہیں' وہ خود دین کے بتائے ہوئے ہیں۔ یہ صاحبِ علم انسان' یہ صاحبِ ضمیر عالم' اپنے اندر یہ قابلیت پیدا کر لیتا ہے کہ بے انتہا فروعات کو' لوگ جو کچھ اُس سے پوچھتے ہیں' وہ دین کے دیے ہوئے اصولوں سے اُن کا استخراج کر سکتا ہے' ان کے جواب لوگوں کے حوالے کر سکتا ہے۔

جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں' یہ سب عالم کی صفات ہیں۔ کیا کوئی عالم ہے جو ان سے زیادہ عظیم کام انجام دیتا ہو۔ یہ بات جاننے کے لیے کہ یہاں حضرت علیؑ نے کسی اور کے نہیں بلکہ علمائے دین کے اوصاف بیان کیے ہیں اس سے بھی بڑا قرینہ یہ ہے کہ آخر میں آپؑ فرماتے ہیں: وَآخَرُ قَدْ تَسَمّیٰ عَالِماً وَلَیْسَ بِهِ. (۱) (اسکے برخلاف ایک شخص وہ بھی ہے جس نے اپنا نام عالم رکھ لیا ہے) مجھے یاد ہے کہ جب خود میں اپنے زمانہ طالب علمی میں قم میں تھا' تو وہاں نہج البلاغہ کے خطبات حفظ کر رہا تھا۔ جو خطبات میں نے حفظ کیے تھے' اُن میں یہ خطبہ بھی شامل تھا۔ اسی وقت مجھے تعجب ہوا تھا' اور میرے ذہن میں خیال پیدا ہوا تھا کہ یہ جملے ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ یہ خطبہ ہر مومن کامل کے اوصاف بیان کر رہا ہے' میں اپنے آپ سے کہتا تھا کہ پھر آخر اس خطبے کے دوسرے حصے میں یہ کیوں فرمایا ہے کہ: وَآخَرُ قَدْ تَسَمّیٰ عَالِماً وَلَیْسَ بِهِ. یعنی اُس دوسرے شخص نے اپنا نام عالم رکھا ہوا ہے' لیکن وہ عالم نہیں

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۸۷

ہے۔ پہلے حصے میں تو عالم کا ذکر نہیں کیا گیا ہے!!! میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ خود پہلے حصے کا مضمون یہ بتا رہا ہے کہ یہ تمام کی تمام ایک عالم اور مرجع دینی کی صفات ہیں' جسے اس طرح ہونا چاہیے۔

اسلام دین میں ماہر کسی شخص کو صرف اس بنا پر کوئی باقاعدہ حیثیت نہیں دیتا کہ اُس نے سالہا سال حصولِ علم میں بسر کیے ہیں' اس راہ میں اپنی ہڈیاں گلائی ہیں' پتا ماری کی ہے' سخت محنت کی ہے' ایسا شخص زیادہ سے زیادہ ایک موثق انسان ہے' خدا اور رسول کی جانب جھوٹی نسبت نہیں دیتا۔ {ایسی حیثیت اور مقام تک پہنچنے کے لیے} اسلام کی نظر میں محض اتنا ہی کافی نہیں ہے' بلکہ عدالتِ کامل لازم ہے' یہی نہیں بلکہ عدالت سے بھی آگے کی ایک خصوصیت لازم ہے' ایک خاص قسم کی صفا' نورانیت اور بصیرت لازم ہے۔ جیسے کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے۔ یہ وحی' نبوت اور امامت نہیں ہے' لیکن ان کے درمیان کی ایک حالت ہے' اور جو ایک سادہ عالم انجام دیتا ہے۔ وہ ایک عالم ہے' اسے اپنی فکری' علمی اور عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے' وہ پیغمبر نہیں ہے' جس کی رہنمائی وحی کرتی ہے۔ لیکن یہ لازم ہے کہ ایک نورانی پشت پناہ بھی اسکے علم' فکر اور عقل کی تائید کرے۔

وہ علما جو غیر صاحبِ شریعت انبیاؑ کے جانشین ہیں

جب اسلام آیا تو اُس نے آخری شریعت کے دور میں گزشتہ انبیا کی کچھ ذمے داریاں علما کے سپرد کر دیں۔

کس قسم کے علما کے سپرد کیں؟

ایک خاص قسم کے علما کے سپرد کیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا' علم وحی کا جانشین اور قائم مقام ہو جاتا ہے' البتہ اُن انبیا کی وحی کا جو صاحبِ شریعت نہیں تھے' یعنی وہ انبیا جو اپنے سے پہلے آنے والی شریعت کو زندہ کرنے والے' اور اسکی میراث کے محافظ تھے۔ اس دور میں علما' علم' کتاب' درس و تدریس اور {گزشتہ انبیا کی} میراث کی حفاظت کے ذریعے شریعت کے محافظ ہیں' لیکن محض ایک خشک و خالی علم کے ذریعے نہیں' بلکہ ایک ایسے علم کے ذریعے جسے انوارِ معنوی کی تائید حاصل ہے۔ اُنہیں لازماً اُس معنوی نور کی پشت پناہی حاصل ہونی چاہیے۔

اس مقام پر ہم ایک نکتہ عرض کریں گے{اور وہ یہ کہ} امیر المومنینؑ کے کلمات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ: مِنْ اِصْدَارِ کُلِّ وَارِدٍ عَلَیْہِ' وَتَصْیِیرِ کُلِّ فَرْعٍ اِلیٰ اَصْلِہِ. آپؑ نے فرمایا ہے کہ' جو کچھ اس میں داخل کیا جاتا ہے' اُسے نکالتا ہے' اور جو فروع اُسکے سامنے پیش کیے جاتے ہیں وہ اصول سے ان کی تطبیق کرتا ہے اور اس تطبیق کی رو سے لوگوں کو جواب دیتا ہے۔ یہی اجتہاد ہے۔ اجتہاد یعنی اصول سے فروع کا استخراج کرنا۔

اجتہاد کی دو اقسام: قیاسی اور غیر قیاسی

ہمارے پاس دو قسم کا اجتہاد پایا جاتا ہے۔ ایک وہ اجتہاد ہے جسے اصطلاحاً اجتہاد رائے یا قیاس کہتے ہیں' یہ وہی چیز ہے جو فقہ اسلامی میں ابو حنیفہ کی اختراع ہے' اور وہی چیز ہے کہ ائمۂ اطہار علیہم السلام نے اس قسم کے اجتہاد سے جس کا نام رائے اور قیاس ہے مقابلہ کیا ہے۔ حق اور انصاف کی بات ہے (اس سے قطع نظر کہ ہم شیعہ ہیں) اگر اسلام کا اختیار رائے اور قیاس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا' اور اگر رائے اور قیاس سے کیے جانے والے اجتہاد سے جنگ نہ کی جاتی' تو دین کی کوئی چیز باقی نہ رہتی۔ پہلے مرحلے میں رائے اور قیاس کے خلاف ہمارے ائمہؑ نے جنگ کی (البتہ اہلِ سنت کے بعض فقہا اور ائمہ نے بھی اسکے خلاف جنگ کی جیسے ''امام مالک'' جو اس طریقے کے مخالف تھے)۔ مالک بن انس جو اہلِ سنت کے چار ائمۂ فقہ میں سے ایک ہیں' انہوں نے اپنی پوری زندگی میں قیاس کی بنیاد پر صرف دو فتوے دیے تھے۔ جب اُن کی موت کا وقت پہنچا تو وحشت زدہ تھے' اور کہتے تھے کے میری وحشت کی وجہ وہ دو فتوے ہیں جو میں نے رائے اور قیاس کی رُو سے دیے تھے۔ ابو حنیفہ نے اس عمل میں افراط سے کام لیا ہے' یعنی انہوں نے احکامِ دین کے استنباط میں اپنی فکر' ظن اور قیاس کو اس قدر دخیل کیا ہے کہ دین دگرگوں ہو گیا ہے۔

تاریخ کی کتابوں میں ایک قصہ نقل کیا گیا ہے' اب مجھے نہیں پتا کہ یہ کسی نے اُن کے طرزِ عمل کی عکاسی کی ہے یا اُس نے مذاق کیا ہے' کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ کو قیاس کرنے کی اس قدر عادت ہو گئی تھی کہ تکوینی معاملات میں بھی شرعی معاملات ہی کی طرح قیاس کیا کرتے تھے' اور بسا اوقات اُن کا قیاس ایک مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتا تھا۔ وہ ایسے مسائل کا ایک دوسرے سے قیاس کیا

کرتے تھے کہ جن میں سرے سے کوئی ربط ہی نہیں ہوتا تھا۔ لکھتے ہیں کہ ابوحنیفہ کی داڑھی کے بال کھچڑی ہو چکے تھے' عربی زبان کے مطابق اشمط ہو گئے تھے۔ جن لوگوں کے بال سیاہ ہوتے ہیں' عام طور پر جب پہل پہل اُن کے سفید بال نکلتے ہیں' تو اُن کا دل نہیں چاہتا کہ یہ سفید بال نمایاں ہوں' لہٰذا وہ انہیں چھپانا چاہتے ہیں' تا کہ لوگوں کو اُن کے بڑھاپے کا علم نہ ہو سکے' یا کم از کم اپنی بیوی سے تو ان بالوں کی بنا پر اُنہیں شرم محسوس ہوتی ہے۔ بہر صورت ابوحنیفہ اپنے بال بنوانے کے لیے نائی کے پاس گئے' اور اُس سے کہا: ان سفید بالوں کو ایک ایک کر کے جڑ سے اُکھاڑ دو۔ نائی نے کہا: کیوں؟ اُنہوں نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ یہ بال دوبارہ نہ نکلیں۔ نائی نے کہا: تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ انہیں جتنا جڑ سے اُکھاڑیں گے اُتنا ہی زیادہ اُگیں گے۔ ابوحنیفہ نے کہا: اگر ایسا ہے تو پھر ایسا کرو کہ میرے سیاہ بالوں کو جڑ سے اُکھاڑ دو۔ انہوں نے فوراً قیاس کیا کہ اگر سفید بالوں کو جڑ سے اُکھاڑا جائے' تو وہ اور زیادہ نکلتے ہیں' تو کیوں نہ میں اپنے سیاہ بالوں کو جڑ سے اکھڑوا دوں تا کہ وہ اور زیادہ نکل آئیں۔ انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ قدرتی طور پر بال اب سفیدی کی جانب بڑھیں گے' {نہ کہ سیاہی کی جانب} یہ غیر موافق صورتحال ہے' اور غیر موافق صورتحال میں قیاس غلط ہے۔ اور جو قیاس انہوں نے کیے ہیں' اور دین میں قیاس کرنے والا ہر شخص کیونکہ شرائط (conditions) کو نہیں سمجھتا' بجائے شرائط کو موافق کرنے کے' غیر موافق شرائط میں عمل کر کے غلطی کرتا ہے۔ یہ وہ اجتہاد ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے۔ لیکن ہمارے پاس ایک جائز اجتہاد بھی ہے' اور وہ وہی ہے جو امیر المومنین کی اس تعبیر میں بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ ہے فروع یعنی شاخوں کا اصولوں اور جڑوں سے استخراج کرنا۔

کلیات وقواعد محدود ہیں اور مسائل لامحدود

ایک معروف حدیث ہے' جسے ابن ادریس نے ''سرائر'' کے آخر میں نقل کیا ہے۔ ابن ادریس ایک ایسے فقیہ تھے جو خبرِ واحد پر عمل نہیں کرتے تھے' جمہورِ فقہا کے برعکس جو اگر خبرِ واحد قابلِ اعتماد ہو تو اُس پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود اُنہوں نے اپنی کتاب ''سرائر'' کے آخر میں' جو ہماری انتہائی اعلیٰ اور گرانقدر فقہی کتابوں میں سے ہے' ایک اختتامیہ رکھا ہے جو

"مستطرفاتِ سرائر" کے نام سے معروف ہے۔ وہاں ایک حصے میں اس انتہائی بدگمان انسان نے جو خبرِ واحد پر عمل نہیں کرتے کچھ ایسے اخبار و احادیث درج کیے ہیں جنہیں وہ نا قابلِ تردید سمجھتے ہیں' خبرِ واحد شمار نہیں کرتے' بلکہ متواتر یا متواتر سے قریب قریب قرار دیتے ہیں۔ وہ حدیث جو (وسائل میں بھی ہے) یہ ہے کہ: عَلَيْنَا الْقَاءُ الْاُصولِ وَعَلَيْكُمُ التَّفْرِيعُ. (۱) ائمہؑ نے کہا ہے کہ اصول و قوانین اور قواعدِ کلی کو بیان کرنا ہماری ذمے داری ہے' یہ ہمارا فریضہ ہے لیکن تفریع کرنا' یعنی' فرع کا اصول سے استخراج کرنا' اور شاخ کو تنے سے نکالنا' تمہاری ذمے داری ہے۔ یہ وہ اجتہاد ہے جو نہ صرف ممنوع نہیں بلکہ لازم اور واجب ہے' اور اسکی وجہ بھی واضح ہے۔ کیونکہ اصول' یعنی کلیات' وہ کلی قوانین جو انسان کے لیے ضروری ہیں محدود اور متناہی ہیں' یعنی محدود اور متناہی رہ سکتے ہیں' لہٰذا قابلِ بیان ہیں۔ لیکن فروع اور جزئیات بے انتہا' لاتعداد اور بے حساب ہیں۔ اگر ایسا ہوتا کہ پیغمبر اکرمؐ اور ائمۂ اطہارؑ نے جس طرح اصول بیان کیے ہیں' اسی طرح وہ تمام فروع بھی بیان کرتے (البتہ جب آپ سے سوال کیا جاتا تھا' تو آپ فروع بھی بیان کرتے تھے) تو وہ قابلِ بیان نہ تھے' لامتناہی تھے' چاہے ان کے حضور کا زمانہ ہو خواہ ان کی غیبت کا زمانہ' ہر دو زمانوں میں تمام فروعات کا بیان کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ اصول محدود ہیں اور فروعات لامحدود۔

ان اصول و فروع کے بارے میں ہم عرض کریں گے کہ ان کی مثال ایسے ہے جیسے کہ آپ علمِ ریاضی (Mathematics) پڑھتے ہیں' تو آپ کو علمِ ریاضی کے طور پر کچھ قواعد پڑھائے جاتے ہیں۔ آپ علمِ ریاضی کے کچھ کلی قواعد سیکھ جاتے ہیں۔ ریاضی کے کلی قواعد محدود ہیں لامتناہی نہیں۔ ریاضی کے تمام قواعد شاید سو یا ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ ہوں' لیکن اسکے مسائل (Problems) کتنے ہیں؟ لامحدود ہیں' وہ مسائل جو پیش کیے جانے کے قابل ہیں وہ لامحدود ہیں۔ آپ اصول و قواعد کو کاملاً سیکھ لیتے ہیں اور اسکے بعد ریاضی کا جو بھی مسئلہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے' آپ ان اصول و قواعد کی روشنی میں جو آپ نے سیکھے ہوئے ہیں جان لیتے ہیں

۱۔ سرائر از ابن ادریس۔ صفحہ ۴۷۸۔ نقل از جامع بزنطی' عبارت میں تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔

کہ اس مسئلے کو کس طرح حل کرنا چاہیے' اس طرح سے یا اُس طرح سے۔ کوئی آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ کیونکہ علمِ ریاضی کے فروع لامتناہی ہیں لہٰذا پے در پے ہر زمانے میں اس علمِ ریاضی کی جگہ ایک دوسرا علمِ ریاضی آنا چاہیے۔ نہیں اب کسی اور علمِ ریاضی کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا جتنی بھی آگے بڑھ جائے ممکن ہے اس میں انسان کو (ریاضی) کے جدید مسائل اور فروع کا سامنا کرنا پڑے' لیکن اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ ریاضی کے اصول منسوخ ہو جائیں تا کہ ان کی جگہ دوسرے اصول لے سکیں۔

دین بھی اسی طرح ہے' اسکے معروف قواعد اور اصول ہیں' اور ایسے فروع ہیں جن کا ان اصولوں سے استخراج کیا جا سکتا ہے۔ وہ چیزیں جو اسلام لے کر آیا ہے اور جو ہمیشہ ناقابلِ تغیر ہیں' وہ کچھ قواعد ہیں اور مجتہدین کا فریضہ محض یہ ہے کہ {ان قواعد سے} استخراج اور استنباط کریں۔ کچھ مسائل ہیں اور مسائل متغیر ہیں' مسائل کے تغیر کی بنیاد قواعد کا تغیر نہیں ہے' بلکہ اسکی بنیاد یہ ہے کہ مسائل کی صورت ہر زمانے میں دوسرے زمانے سے مختلف ہے' زندگی میں داخل ہونے والے عوامل (factors) مختلف زمانوں میں مختلف ہوا کرتے ہیں' بعض عوامل کے زندگی میں داخلے اور اسکے نتیجے میں بعض عوامل کے زندگی سے اخراج کی وجہ سے لازماً مسائل اور اُن کے جو جواب دیے جانے چاہئیں اُن کی صورت میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر اسلامی احکام و قوانین ثابت و لامتغیر پہلو رکھنے کے باوجود ایک متغیر پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔ ائمۂ اطہار اور خود پیغمبر اکرم کی بہت سی آراء فروع ہیں جن کا آپ حضرات نے اصولوں سے استخراج کیا ہے' یعنی عملی طور پر عَلَیْنَا اِلْقَاءُ الْاُصولِ وَعَلَیْکُمْ اَنْ تَفَرَّعوا' یا: عَلَیْنَا اِلْقَاءُ الْاُصولِ وَعَلَیْکُمُ التَّفْرِیعُ کی مصداق تھے۔ اگر ائمہؑ نے اپنے بعض اصحاب سے یہ فرمایا ہے کہ جاؤ مسجد میں جا کر بیٹھو اور ہمیں یہ بات پسند ہے کہ تمہاری طرح کا کوئی شخص مسجد میں جائے اور وہاں بیٹھ کر فتوا دے (کیونکہ جو کوئی آ کر مسند پر بیٹھ جاتا تھا لوگ اُسے عالم سمجھ کر باقاعدگی سے آ کر اُس سے سوال کیا کرتے تھے) تو یہ اسی بنا پر تھا' اسی بنا پر تھا کہ آپ نے انہیں کلی تعلیمات سے آشنا کر دیا تھا اور آپ کہتے تھے کہ فروعات کا خود تم ان سے استنباط اور استخراج کرو۔

علم کے فرض ہونے کی مثال

یہاں ہمارے پاس بہت سی مثالیں ہیں' جنہیں ہم آج ہی کی رات بیان کر دینا چاہتے تھے' لیکن وہ تمام مثالیں بیان نہیں کر سکیں گے۔ ہم آپ کے سامنے ایک ایسی مثال عرض کرنا چاہتے ہیں جو شاید نئی مثال ہو۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک جملہ ہے' جسے سب ہی نے سُن رکھا ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ. اور بعض نقول میں ہے کہ: عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ' دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا بہت عجیب بات ہے کہ اگر مُسْلِمَةٍ ہو تب اس میں عورتیں بھی شامل ہوں گی' بصورتِ دیگر عورتیں شامل نہیں ہوں گی۔ اس قسم کے مسائل میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ کیونکہ آیت: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ. (۱) میں الَّذِينَ ہے اور الَّذِينَ مرد {یعنی مذکر} کے لیے مخصوص ہوتا ہے' نیز کیونکہ اس میں: اَللاتی يَعْلَمْنَ نہیں کہا گیا {لہٰذا اس میں عورتیں شامل نہیں ہیں}۔ دراصل مؤنث کا ضمیر عورتوں کے لیے مخصوص ہوا کرتا ہے' جبکہ مذکر کا ضمیر اکثر {عورت اور مرد} دونوں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے' ماسوا یہ کہ وہاں مذکر کے لیے کوئی قرینہ موجود ہو۔ یا آیت: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ. (۲) میں مذکر کا ضمیر ہے' لہٰذا ہم یہ کہیں کہ مردوں میں فضیلت کا معیار تقویٰ ہے' لیکن عورتوں میں نہیں۔ نہیں جناب' {تقویٰ} عورت یا مرد سے مخصوص نہیں ہے۔ اسی طرح آیۂ کریمہ: اَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ. (۳) میں سارے کے سارے مذکر کے ضمیر ہیں۔ یہ واضح سی باتیں ہیں ان پر گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۔ سورۂ زمر ۳۹۔ آیت ۹ {کہہ دیجیے کہ کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان کے برابر ہو جائیں گے جو نہیں جانتے ہیں}

۲۔ سورۂ حجرات ۴۹۔ آیت ۱۳ {بے شک تم میں سے زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے}

۳۔ سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۲۸ {کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دے دیں یا صاحبانِ تقویٰ کو فاسق و فاجر افراد جیسا قرار دے دیں}

علم کے واجب ہونے کے بارے میں غزالی کا خوبصورت قول

بہر حال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ. حصولِ علم ہر مسلمان پر واجب ہے۔ ایک مسئلہ علمائے دین کے درمیان زیر بحث رہا ہے اور جہاں تک میں نے دیکھا ہے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اُسے غزالی نے {اپنی کتاب} "احیاء العلوم" میں بیان کیا ہے اور مرحوم فیض {کاشانی} نے بھی اُسے "محجۃ البیضاء" میں نقل کیا ہے' مسئلہ اس بارے میں ہے کہ وہ علم جس کے لیے پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ اس کا حصول واجب ہے' وہ کونسا علم ہے؟ اس بارے میں غزالی نے بیس اقوال نقل کیے ہیں: متکلمین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد علمِ اصولِ دین اور علمِ کلام ہے' مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد علمِ تفسیر ہے' فقہا کہتے ہیں کہ اس سے علمِ فقہ مراد ہے' ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ علم مراد ہے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ علم مقصود ہے۔ ان سب کا جواب انتہائی واضح ہے۔ غزالی نے بہت عمدہ بات کی ہے اور فیض {کاشانی} نے بھی اُسکی تائید کی ہے' وہ کہتا ہے: علوم کی دو اقسام ہیں: بعض علوم بذاتہٖ دین میں ہدف و مقصد ہیں' مثلاً اللہ کی معرفت' جو ہر انسان پر واجبِ عینی ہے۔ بعض علوم ایسے ہیں کہ جن میں خود علم مقصد نہیں ہے' بلکہ علم وسیلے (Medium) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع پر اسلام کے مقاصد میں سے جس مقصد کا حصول کسی خاص علم پر موقوف ہو' وہ علم واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسلام میں طبابت (Medicine) ایک واجب کفائی ہے' اور علمِ طب اسکے لیے وسیلہ ہے' پس علمِ طب واجبِ کفائی کی صورت میں واجب ہو جاتا ہے۔ پس حدیث: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیضَۃٌ اسے بھی اپنے اندر شامل کر لے گی۔ تجارت واجبِ کفائی ہے اور اسکے لیے جس حد تک علم کی ضرورت ہے' اُتنے علم کا حصول واجب ہے۔ تجارت کے لیے جس قدر علمِ اقتصاد کے حصول کی ضرورت ہے {اُتنا اس کا حصول واجب ہے}۔ اسی طرح اور دوسرے علوم کا معاملہ ہے۔ ہمارے بیان کردہ عرائض کی بنیاد پر آپ بہت سی چیزوں پر قیاس کر سکتے ہیں۔

پس علم واجب ہے' فریضہ ہے۔ لیکن علما کی اصطلاح میں ایک واجبِ نفسی تہیّوی ہے' ایسا واجب ہے جو کسی دوسرے واجب پر عمل کا مقدمہ ہے۔ معرفتِ الٰہی اور اسی طرح کے علوم خود اپنی

جگہ پر {واجب ہیں} اور بہت سے علوم ایسے ہیں جو ایک دوسرے واجب کی ادائیگی کے لیے مقدمے کے طور پر واجب ہیں۔

ممکن ہے آپ سوال کریں کہ کیا اس بات میں مختلف زمانوں میں فرق واقع ہوسکتا ہے۔ یعنی ایک زمانے میں ایک علم واجب ہو اور دوسرے زمانے میں واجب نہ ہو ایک زمانے میں واجب ہو اور ایک دوسرے زمانے میں واجب تر ہو ایک زمانے میں حرام ہو اور دوسرے زمانے میں واجب، کیا اس قسم کی بات ہوسکتی ہے یا نہیں؟

بالکل ہوسکتی ہے۔ کیونکہ علم ایک مقدماتی واجب ہے اور اُس مقصد سے وابستہ ہوتا ہے جس کے حصول کا ذریعہ ہو۔ کبھی وہ مقصد مسلمانوں کے لیے اہمیت اختیار کر لیتا ہے {اور کبھی اپنی اہمیت کھو بیٹھتا ہے} اور جس قدر اس مقصد کی اہمیت بڑھتی ہے اُتنی ہی اسکے حصول کے لیے درکار علم کی اہمیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایک دور میں طبیعت شناسی (Natural Sciences) واجب نہیں تھی یا انتہائی کمزور سا واجب تھی۔ لیکن اسلام کا ایک حکم ہے، مثلاً وہ کہتا ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ. (۱) دشمن کے مقابل زیادہ سے زیادہ طاقت جمع کر کے رکھو۔ یہ ایک واجب ہے ایک ایسا واجب ہے کہ زمانۂ قدیم کے برخلاف موجودہ زمانے میں اس کا دارومدار علم پر ہے۔ یعنی وہ طاقت جو زیادہ سے زیادہ قوت ہوسکتی ہے ہمارے زمانے میں علم کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ لازماً اس کا علم واجب ہو جائے گا۔

کیا ایٹم سے متعلق معلومات کا علم مسلمانوں پر واجب ہے؟ ہاں، واجب ہے۔ کیا یہ علم پانچ سو سال پہلے بھی واجب تھا؟ نہیں، یہ ایک مقدماتی علم تھا، لزوم نہیں رکھتا تھا۔ آج یہ علم اسلام کے ہدف کی تکمیل کرتا ہے، لہٰذا آج یہ واجب ہے۔

آج یہ کس درجے کا واجب ہے؟

اسکے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ. کا درجہ کیا

۱۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۶۰

ہے۔ ممکن ہے یہ ایک ایسا واجب ہو جائے جو ہمارے واجبات میں سرفہرست ہو۔

اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے؟

وہی {سمجھ سکتا ہے} جس کے متعلق امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے کہ: مِنْ تَصْبِیرِ کُلِّ فَرْعٍ اِلیٰ اَصْلِہٖ۔ وہی جس کے متعلق امامؑ نے فرمایا کہ: عَلَیْنَا اِلْقَاءُ الْاُصُولِ وَعَلَیْکُمُ التَّفْرِیع۔ ایسا شخص جو اسلام کے کلیات سے واقف ہو' اصولِ اسلام سے آشنا ہو' اسلام کے مقاصد سے باخبر ہو' اور جس میں وسائل کی تشخیص کی صلاحیت ہو' اور جو اتنی سمجھ بوجھ رکھتا ہو کہ کونسی چیز ہدف ہے اور کونسی شئے وسیلہ۔ وسیلے کو حاصل ہونے والی اہمیت' اُسکے ذریعے حاصل کیے جانے والے ہدف سے وابستہ ہوتی ہے۔ ایسا ہی شخص ایک روز کہہ سکتا ہے کہ آج فلاں علم اوّلین درجے کی اہمیت کا حامل ہے' اور فتویٰ دے سکتا ہے کہ مسلمانوں پر اس علم کا حصول واجب ہے۔

اسلام کے ہر دور پر منطبق ہونے کی نوعیت

یہاں سے آپ اس بات کے معنی سمجھ سکتے ہیں کہ درحقیقت اجتہاد اسلام کی قوتِ محرکہ ہے' اس دین کو تحرک بخشتا ہے' باوجودیکہ کوئی چیز نسخ نہیں ہوتی' تبدیل نہیں ہوتی' کوئی حلال حرام نہیں ہوا اور نہ کوئی حرام حلال ہوا ہے' حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلیٰ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَحَرَامُهٗ حَرَامٌ اِلیٰ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ۔ (۱) نہ کوئی حلال حرام ہوا ہے اور نہ کوئی حرام حلال ہوا ہے' نہ کوئی حکم منسوخ ہوا ہے اور نہ کسی نے اپنی طرف سے کوئی حکم وضع کیا' بنایا' یا اپنی طرف سے لایا ہے۔

جو لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ اسلام کس طرح اپنے آپ کو زمانے کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرتا ہے؟ {اُن کو جواب یہ ہے کہ} اسلام اسی طرح اپنے آپ کو زمانے سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ کیونکہ زمانہ اصول کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہے' زمانے کے لیے اصول کو بدلنا محال ہے۔ وہ چیز جسے زمانہ بدلتا ہے' اسلام نے اُس میں تغیر و تحرک کی ایک طاقت رکھی ہے۔ اور وہ چیز جس پر اسلام کھڑا ہے اور کہتا ہے: حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ.... وہ ایسا مستقل اصول ہے جسے زمانہ بدلنے کی

۱۔ اصولِ کافی۔ ج ۲۔ ص ۱۷

قدرت نہیں رکھتا۔ وہ انسانیت کا مدار ہے۔ اگر ایک دن انسان اپنے مدار سے حیوان کے مدار میں داخل ہو جائے' تو وہ اصول بدل جائے گا' اگر اپنے مدار سے نکل کر گھوڑے اور گائے کے مدار میں آ جائے' تو بدل جائے گا' اگر جمادات کے مدار میں آ جائے تو بدل جائے گا' لیکن انسان کو انسانیت کے مدار سے خارج نہیں ہونا چاہیے۔ انسان ارتقا پاتا ہے لیکن اسی مدار میں ارتقا حاصل کرتا ہے' اور اصول اسی مدار کو مشخص کرتا ہے' راستے کو معین کرتا ہے۔

پس یہی وجہ ہے کہ دین اسلام جو دین خاتم ہے زمانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے' اور ساتھ ساتھ زمانے کو کنٹرول بھی کرتا ہے' کیونکہ زمانے میں انحراف پیدا ہو سکتا ہے' اور ہمیشہ زمانے کے تغیرات درست نہیں ہوتے' زمانہ معصوم نہیں ہے' زمانے میں پیدا ہونے والے تغیرات اور تبدیلیاں انسان کے ہاتھوں اور انسان ہی کی طرف سے ہوتی ہیں' اور جو چیز بھی انسان کی طرف سے پیدا ہوتی ہے' ممکن ہے (درست ہو اور ممکن ہے) درست نہ ہو' ممکن ہے تقدم ہو ممکن ہے انحراف ہو' ممکن ہے پیشرفت ہو ممکن ہے خطا ہو۔ ایک طرف تو اسلام زمانے کے انحرافات کے خلاف بھرپور جنگ کرتا ہے اور دوسری طرف زمانے کی حقیقی پیشرفت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کے آگے بڑھتا ہے۔ نہ صرف زمانے کی پیشرفت کا ساتھ دیتا ہے' بلکہ زمانے کی قیادت کرتا ہے' اور خود زمانے کو آگے لے کے بڑھتا ہے۔ اس حوالے سے بہت سی مثالیں ہیں' انہیں ہم انشاءاللہ آئندہ نشستوں میں آپ کی خدمت میں عرض کریں گے۔

آٹھواں خطاب

ارکانِ خاتمیت

آٹھواں خطاب

ارکانِ خاتمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ... قالَ علیٌّ علیه السلام: وَاعْلَمُوا اَنَّ عِبَادَ اللّٰهِ الْمُسْتَحْفَظِيْنَ عِلْمَهُ يَصُوْنُوْنَ مَصُوْنَهُ وَيُفَجِّرُوْنَ عُيُوْنَهُ. يَتَوَاصَلُوْنَ بِالْوِلَايَةِ وَيَتَلَاقَوْنَ بِالْمَحَبَّةِ وَيَتَسَاقَوْنَ بِكَأْسٍ رَوِيَّةٍ وَيَصْدُرُوْنَ بِرِيَّةٍ لَا تَشُوْبُهُمُ الرِّيْبَةُ وَلَا تُسْرِعُ فِيْهِمُ الْغِيْبَةُ. عَلٰى ذٰلِكَ عَقَدَ خَلْقَهُمْ وَ أَخْلَاقَهُمْ فَعَلَيْهِ يَتَحَابُّوْنَ وَ بِهِ يَتَوَاصَلُوْنَ فَكَانُوْا كَتَفَاضُلِ الْبَذْرِ يُنْتَقٰى فَيُؤْخَذُ مِنْهُ وَيُلْقٰى فَذَمِيْزُهُ التَّخْلِيْصُ وَهَذَّبَهُ التَّمْحِيْصُ. (۱)

مسئلۂ خاتمیت کے بارے میں ہماری گفتگو کی نشستیں بہت طولانی ہوگئیں۔ اگر یہ گفتگوئیں کچھ حد تک غیر منظم رہیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ مسائل و مباحث جن پر اس سے پہلے دوسروں نے گفتگو نہ کی ہو اور ان مسائل کے بارے میں زیادہ بحث و گفتگو نہ ہوئی ہو، حتیٰ انہیں بیان کرنے والے شخص نے خود بھی انہیں اس طرح اور اس انداز سے بیان نہ کیا ہو، وہ چار و ناچار اُس طرح جس طرح اُنہیں بیان کرنے کی ضرورت ہے اور جیسا اُنہیں بیان کیا جانا

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۱۳

چاہیے ابتدا میں منظم انداز میں بیان نہیں ہو سکتے۔

اس مقصد سے کہ محترم سامعین اس بحث پر مکمل توجہ مرکوز رکھیں اور دیکھیں کہ دینی طلاب کی اصطلاح میں ہمارے اس بحث میں ورود اور خروج کی صورت کیا رہی{۱} آج ہم آپ کی خدمت میں اس کا ایک مفید خلاصہ عرض کریں گے تاکہ بات اچھی طرح آپ تک پہنچ جائے۔

خاتمیت کا پہلا رکن: انسان اور معاشرہ

خاتمیت کے بارے میں ہماری بحث مجموعی طور پر چار حصوں میں ہے اور درحقیقت ہماری اس بحث کے چار رکن اور چار ستون ہیں۔ اس کا پہلا رکن اور پہلا ستون انسان اور معاشرہ ہے اس اعتبار سے کہ کیا انسان اخلاق کے لحاظ سے طرز تربیت کے لحاظ سے اور سماج اور سماجی تنظیمات کے لحاظ سے ایک ثابت جامد اور یکسانیت کا حامل وجود ہے؟ کیا ہر دور اور ہر زمانے میں انسان کا طرز حیات یکساں رہنا چاہیے جیسے شہد کی مکھی کا ہوا کرتا ہے؟ یا اسکے برعکس انسان انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے ایک تحول تکامل اور تغیر پذیر وجود ہے؟

اگر انسان سو فیصدی ایک ثابت موجود ہو تو اُسکی زندگی کے قوانین بھی سو فیصدی ثابت اور غیر متغیر ہونے چاہئیں۔ اور اگر انسان ایک سو فیصدی تغیر اور تحول پذیر موجود ہو تو معاملا اسکے برعکس ہوگا کوئی قانون ثابت نہیں رہ سکے گا اسکے قوانین کو ہمیشہ اور پیہم متغیر ہونا چاہیے۔

یا ایسا نہیں ہے بلکہ ایک تیسری بات فرض کرنی ہوگی اور صحیح بھی یہی ہے اور وہ یہ کہ انسان کچھ پہلوؤں میں ثابت ہے اور کچھ میں متغیر۔ ایک اعتبار سے اُسے ایک ثابت اصول کی پیروی کرنی چاہیے لیکن دوسرے پہلوؤں میں اُسے متغیر حالات کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس لحاظ سے وہ بالکل انسانی بدن کی طرح ہے جو کروڑوں خلیوں (Cells) کا ایک مجموعہ ہے۔ ان خلیوں کا ایک بڑا حصہ مسلسل مرتا رہتا ہے اور نئے خلیے پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن خلیوں کا ایک حصہ جو عصاب کے سلسلے کو تشکیل دیتا ہے اور بدن کی اصل فعالیت (Activity) ان کے ذریعے ہوتی

{یعنی کس طرح ہم نے اس بحث کا آغاز کیا اور کیسے اسے اختتام تک پہنچایا}

ہے' وہ ثابت اور دائمی ہیں۔ انسانی زندگی کے قوانین بھی اسی طرح ہیں۔ انسانی زندگی کے اصول' انسانی زندگی کے بنیادی خاکے جو اُسکے ارتقا کے لیے سازگار ماحول فراہم کرتے ہیں وہ ثابت اور لا متغیر قوانین ہیں لیکن انسانی زندگی کی فروعات تغیر پذیر ہیں۔

انسان متغیر ہے لیکن ایک ثابت مدار کا مالک ہے

بعض لوگوں نے یہ تعبیر استعمال کی ہے کہ: انسان ایک متغیر موجود ہے' لیکن اِسکے تغیر کا مدار ایک ثابت مدار ہے' جیسے کہ چاند متغیر ہے اور ہر لمحے اپنی جگہ بدلتا رہتا ہے' لیکن چاند کا مدار ایک ثابت مدار ہے' اور چاند اپنے اِس مدار سے باہر نہیں نکلتا' اگر اتفاقاً اپنے مدار سے باہر نکل جائے' تو یا تو زمین سے قریب ہو گا یا اُس سے دور ہو جائے گا' {اِسکے نتیجے میں} زمین کے حالات بھی درہم برہم ہو جائیں گے اور چاند کے حالات میں بھی تلاطم پیدا ہو جائے گا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ: اگر چاند زمین سے اپنے مقررہ فاصلے سے ذرا سا بھی قریب آ جائے' تو سمندروں میں طغیانی آ جائے' وہ زمین پر چڑھ آئیں اور زمین پر کوئی صحرائی جاندار باقی نہ رہے' کیونکہ سمندروں کا مدوجزر چاند کی وجہ سے ہے۔ سمندروں میں اِس وقت پائی جانے والی مدوجزر کی یہ حالت اور سمندروں کی موجودہ صورتحال چاند کے مدار کی موجودہ کیفیت سے وابستہ ہے۔ اور اگر یہ ذرا دور ہو جائے تو دوسرے تغیرات جنم لیں گے۔ لیکن چاند باوجود یہ کہ اُسکی حرکت کا مدار ثابت ہے خود ثابت نہیں ہے' خود مسلسل حرکت میں ہے اور آپ ہر رات کو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک نقطے سے ہمارے سامنے طلوع ہوتا اور دوسرے نقطے پر غروب ہو جاتا ہے۔ اور اسکے طلوع اور غروب کے نقطے ہر رات پہلی رات سے مختلف ہوتے ہیں: رَبُّ الْمَشارِقِ وَالْمَغارِبِ.

اور اِسی طرح سورج کی نسبت سے زمین کا معاملہ ہے۔ زمین کا مدار ایک معین مدار ہے۔ اگر زمین اپنے مدار سے باہر نکل جائے اور مریخ یا زحل کے مدار میں چلی جائے' مختصر یہ کہ اپنے موجودہ مدار سے باہر نکل جائے اور سورج سے اپنے موجودہ فاصلے سے قریب یا دور ہو جائے' تو روئے زمین پر زندگی بسر کرنے والی موجودات کی صورتحال یکسر بدل کے رہ جائے۔ اگر مثلاً

{زمین} عطارد کے مدار میں جا پہنچے تو روئے زمین کے تمام جاندار جل کے راکھ ہو جائیں اور اگر زحل کے مدار میں پہنچ جائے تو شاید زمین دنیا کی قیمتی ترین شئے {یعنی} حیات کے تحفظ کی صلاحیت کھو بیٹھے۔

انسان ایک تغیر وتحول پذیر موجود ہے۔انسان کو ایک جگہ ٹھہرا اور رکا ہوا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اُسے متغیر اور متحرک ہونا چاہیے۔لیکن انسان کا مدار ایک خاص مدار ہے اُسکے مدار کو ثابت ہونا چاہیے۔اگر وہ اپنے مدار سے نکل کر حیوان کے مدار میں داخل ہو جائے تو ہلاک اور تباہ ہو جائے گا۔اور اگر مثلاً وہ فرشتوں کے مدار میں داخل ہونا چاہے اور فرشتوں کے مشابہ ہو جائے تب بھی وہ اپنے مدار سے خارج ہو گیا ہے۔افراط اور تفریط دونوں ہی انسانیت کے مدار سے نکل جانا ہیں۔مدارِ انسانیت وسطیت اور جامعیت کا مدار ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا . . . . (۱) زاہد و عابد افراد ایسے لوگ جو اپنے خیال میں عروج اور کمال کا حصول چاہتے تھے وہ پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ سے اپنے آپ کو خصی کر لینے کی اجازت طلب کرتے کہتے کہ: هَلْ لی اَنْ اَخْتَصِیَ؟ (۲) ہمیں اپنے آپ کو خصی کر لینے کی اجازت دیجیے؟ ہم اپنے اندر سے شہوت کی جڑ ہی کاٹ دینا چاہتے ہیں تاکہ بہتر انداز سے یکسوئی کے ساتھ پروردگار کی عبادت کر سکیں۔اُن کا خیال تھا کہ اگر اپنے آپ کو کھانے اور سونے کی قید سے بھی آزاد کر سکیں تو کر لیں۔لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اُنہیں {اِس بات کی} اجازت نہیں دی اور دوٹوک الفاظ میں {اِس سے} منع فرمایا۔پیغمبر اکرمؐ انسان کو انسانیت کے مدار میں رکھتے تھے کسی صورت اُسے مدارِ انسانیت سے خارج کرنا نہیں چاہتے تھے۔اسلام انسان کے لیے ایک تکوینی اور متعین راستے کا قائل ہے جسے وہ صراطِ مستقیم سے تعبیر کرتا ہے۔

ہماری گزارشات کا ایک رکن یہ ہے کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جسے ثابت بھی رہنا چاہیے اور متغیر بھی۔لہٰذا قدرتی بات ہے کہ اُسکی زندگی کے لیے کچھ قواعد اور اصول ثابت بھی

۱۔سورۂ بقرہ ۲۔آیت ۱۴۳

۲۔(اہلِ سنت کی بعض کتب میں اس صورت سے درج ہے: الاتخصی . . . .)

ہونے چاہئیں اور اُسے اُن کی پیروی کرنی چاہیے اور ساتھ ساتھ کچھ متغیر قوانین اور دستور بھی ہونے چاہئیں۔ پس ہماری گفتگو کا ایک رکن انسان ہے' جس کے بارے میں ہم اِس سے پہلے ''جبرِ تاریخ'' کے عنوان کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔

دوسرا رکن: اسلامی قانون سازی کی خاص نوعیت

خاتمیت کا ایک اور رکن اسلام میں قانون سازی کی نوعیت ہے۔ ہم نے اسلام کے بارے میں عرض کیا تھا کہ اسلام میں ثابت اصول بھی ہیں اور متغیر فروع بھی' جن کی بنیاد وہی ثابت اصول ہیں۔ اسلام' انسان کے ثابت پہلوؤں کے لیے اور وہ چیزیں جو انسان کے مدارِ انسانیت کو تشکیل دیتی ہیں اور جنہیں ثابت رہنا چاہیے {اُن کے لیے} ثابت قوانین لے کر آیا ہے' لیکن وہ چیزیں جو مدارِ انسانیت سے مربوط نہیں ہیں' اُس نقطے سے مربوط ہیں جس کے مدار میں انسان رہتا ہے' اسلام {اُن کے لیے} متغیر فروع کا حامل ہے' لیکن انہی ثابت اصولوں کے دائرے میں' یا پھر اُس نے اِس میں دخل ہی نہیں دیا اور انسان کو آزاد اور خود مختار چھوڑ دیا ہے۔

تیسرا رکن: علم اور اجتہاد

تیسرا موضوع' یا ہماری گفتگو کا تیسرا رکن علم و اجتہاد اور علما و مجتہدین ہیں۔ جب عالمِ دین اسلام کی روح سے آشنا ہو' اور فروع کو اصول پر پلٹا سکے' جب اسلام کے مقاصد سے واقف ہو اور وسائل کو بھی پہچانتا ہو' ہدف اور وسیلے کے درمیان غلط فہمی کا شکار نہ ہو' وسیلے کو ہدف اور ہدف کو وسیلہ نہ سمجھے' صحیح اور سقیم کی پہچان رکھتا ہو' جب اسلام کی روح سے آشنا ہو' ویسا ہی بن جائے جس کے متعلق امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے: قَدْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلّٰهِ (سُبْحَانَهُ) فِي أَرْفَعِ الْأُمُورِ' مِنْ إِصْدَارِ كُلِّ وَارِدٍ عَلَيْهِ' وَتَصْيِيرِ كُلِّ فَرْعٍ إِلَىٰ أَصْلِهِ. تب اُس نے اپنا حقیقی فرض ادا کیا ہے۔ حقیقی علما و مجتہدین خاتمیت کا تیسرا رکن شمار کیے جاتے ہیں' اور آخری شریعت میں مجتہد اور عالم کی حیثیت ایک عظیم کارخانے میں کام کرنے والے انجینئر کی سی ہے' نہ کہ اُسکے بانی کی۔ وہ لوگ جو اس کارخانے کے انجینئر ہیں اور جو یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح اس کارخانے

کو چلایا جا سکتا ہے' یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم مجتہد یا فقیہ کہتے ہیں۔ مجتہد یا فقیہ وہ ہے جو دین میں بصیرت رکھتا ہے۔ یہ مسئلۂ خاتمیت کا تیسرا رکن ہے۔

چوتھا رکن: تفقہ اور اجتہاد کے موضوعات کی خاص کیفیت

خاتمیت کے مسئلے میں چوتھا رکن وہ چیز ہے جو تفقہ' تفکر اور اجتہاد کا موضوع ہے' یعنی وہ چیز جس کی بنیاد پر اور جس پر تفقہ اور اجتہاد ہونا چاہیے' اور وہ قرآن' سنت' اجماع اور عقل ہے۔ البتہ ہم فی الحال عقل اور اجماع کے بارے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ قرآن و سنت کا مسئلہ ایک علیحدہ رکن ہے۔ کس اعتبار سے؟ اُس اعتبار سے جسے ہم عرض کریں گے' اور وہ یہ ہے: ایک مسئلہ جو ہمارے درمیان موجود ہے' وہ یہ ہے کہ کیا فہمِ قرآن' قرآن کے معنی کا ادراک اور اسکے حقائق کا استخراج وہ چیز ہے جو ماضی میں انجام دی جا چکی ہے؟ یا نہیں' قرآن ہر زمانے میں جدید مطالعے کا موضوع بن سکتا ہے' بلکہ اُسے جدید مطالعے کا موضوع بننا چاہیے۔ بالفاظِ دیگر کیا وہ ''نگاہ'' جس ''نگاہ'' کے ساتھ اسلامی منابع و ماخذ کا مطالعہ ہونا چاہیے ایک ثابت اور یکسانیت کی حامل نگاہ ہے' یا ایک تغیر اور تکامل پذیر نگاہ ہے؟

اگر {اس بارے میں} میں اپنا مقصود وضاحت کے ساتھ پیش کر سکوں تو اچھا رہے گا۔

دنیا میں ہمارے پاس ایسی کتابیں ہیں جنہیں انسانوں نے تالیف کیا ہے۔ یہ کتب کتنی ہی عالی ہوں' کتنی ہی مشکل ہوں آخر کار ایک موضوع تک محدود ہوتی ہیں' ایک فرد' دو افراد' پانچ ماہرین جو اِن {کتب} پر کام کرتے ہیں' وہ ایسی اچھی طرح اِن کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ آئندہ آنے والوں کے لیے اِن پر کوئی کام باقی نہیں رہتا۔ مثلاً گلستانِ سعدی ایک شاہکار ہے۔ ہم گلستانِ سعدی پر کس قدر کام کر سکتے ہیں کہ تہہ در تہہ اس کا ایسا عمدہ تجزیہ و تحلیل کر ڈالیں' کہ اگر اِسکے اشعار میں سے کسی بھی شعر کے' اِسکی شاندار نثر کے کسی بھی جملے کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے کہ اسے کیسے پڑھنا چاہیے' اس سے کیا معنی لیے جانے چاہئیں تو ہم بتا سکیں؟ مسلّمہ طور پر یہ ایک محدود چیز ہے۔ چند دانشور' ادیب اور فاضل افراد جو عربی اور فارسی ادبیات سے واقف ہوں' سعدی کے دور کی تاریخ اور اُسکے زمانے کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں' وہ

گلستان کی شرح کر سکتے ہیں، اور کی بھی ہے۔ گلستان ایک ایسی کتاب ہے جس کی شرح ہو چکی ہے، گلستان میں صرف دو یا تین ایسے الفاظ رہ گئے ہیں جو ابھی تک قطعی اور مسلّم نہیں اور شاید غلط لکھ دیے گئے ہیں اور شاید ان کے بارے میں جو توجیہات کی گئی ہیں وہ درست ہی ہوں۔

مثلاً گلستان کے دیباچے میں وہ کہتا ہے: "...ذکر جمیل سعدی که در افواه عوام افتاده و قَصَبُ الْجَیْبِ حدیثش..." اس کلمے "قَصَبُ الْجَیْب" کا بھید ابھی تک نہیں کھلا کہ آخر اسکے کیا معنی ہیں؟ کیونکہ قصب کے معنی بانسری ہیں اور جیب کے معنی گریبان، لیکن یہاں قَصَبُ الْجَیْب کے کیا معنی ہیں؟ فلاں نسخے میں ایسا تھا اور فلاں نسخے میں ویسا، کس نے ایسا کہا ہے اور فلاں دوسرے شخص نے ویسا۔

اسی طرح سے سعدی کا یہ شعر ہے:

تا مرد سخن نگفته باشد عیب و هنرش نهفته باشد
هر بیشه گمان مبر که خالی است شاید که پلنگ خفته باشد

اس شعر کو متعدد طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے، ایک یہی انداز ہے کہ جس سے ہم نے پڑھا ہے، ایک اور طریقہ یہ ہے: هر بیشه گمان مبر که خالی است (خال) شاید که پلنگ خفته باشد، ممکن ہے یہاں بیشہ نہ ہو بلکہ بیسہ ہو: هر بیسه گمان مبر که خالی است (خال) شاید که پلنگ خفته باشد. بہت سوں نے کہا ہے کہ یہ آخری درست ہے۔

فردوسی کا شاہنامہ بھی اسی طرح کا ہے، تاریخِ بیہقی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ تاریخِ بیہقی فارسی زبان میں ہے اور غزنویوں کے دور میں لکھی گئی ہے، اور قدرتی بات ہے کہ اس میں بعض مشکلات ہیں۔ کئی افراد نے اسکی شرح کی ہے اور آخر کار اسکی گتھیوں کو سلجھا لیا گیا ہے، اسکے بعد اگر کوئی اس پر کام کرنا چاہے تو یہ ایک غیر ضروری کام ہوگا۔

طبیعت کا مطالعہ لامتناہی ہے

لیکن کبھی ایک انسان کے مطالعے کا موضوع طبیعت (Nature) ہوتی ہے۔ کیا طبیعت کا مطالعہ گلستانِ سعدی کے مطالعے جیسا ہے؟ چند صاحبانِ علم نے اس کا مطالعہ کر لیا ہے، اسے

پوری طرح سمجھ لیا گیا ہے' اب دوسرے لوگوں کو اس کے مطالعے کی ضرورت نہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بقیہ لوگ اُن کی لکھی گئی شرحوں سے رجوع کریں؟ یا نہیں' انسان جتنا طبیعت پر کام کرے گا اُس پر نئے نئے انکشافات ہوں گے۔

ارسطو ایک ماہرِ طبیعیات تھا' وہ ایک فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہرِ طبیعیات بھی تھا۔ بوعلی سینا نے بہت سے نکات پر ارسطو کی مخالفت کی ہے۔ ابن رشد اندلسی بھی ایک فلسفی تھا' وہ ارسطو کا شدید حمایتی تھا' اسی بنا پر ابن سینا سے شدید نفرت کیا کرتا تھا' اُس سے ناراض تھا کہ اُس نے کیوں ارسطو کی مخالفت کی ہے۔ اُس نے غیر معمولی طور پر اس بات کی کوشش کی ہے کہ جہاں کہیں بھی بوعلی نے ارسطو کی مخالفت کی ہے' وہاں بوعلی کو رد کرے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بات وہی صحیح ہے جو ارسطو نے کہی ہے' اور ارسطو سے بڑھ کر درست کسی کی بات نہیں ہے۔

اہلِ یورپ کا کہنا ہے کہ: ''طبیعت کی تشریح ارسطو نے کی ہے اور ارسطو کی تشریح ابن رشد نے''۔ ابن رشد' ارسطو کے کلمات کی تشریح کے لیے اپنی تمام مساعی بروئے کار لایا ہے۔ لیکن مسلّمہ طور پر یہ ایک غلط فہمی ہے' طبیعت اس سے کہیں زیادہ عظیم ہے' ہزاروں بلکہ لاکھوں ارسطو جمع ہو جائیں تب بھی وہ اسکی اس طرح تشریح نہیں کر سکتے جیسی وہ ہے۔

ارسطو کے دور سے اب تک انسان نے جس قدر زیادہ طبیعت کا مطالعہ کیا ہے اُتنا ہی اُسے اپنے عجز و ناتوانی کا مزید علم ہوا ہے۔ ارسطو کے زمانے سے دو ہزار چار سو سال بعد آئن اسٹائن جو ہمارے دور کا ایک عظیم ماہرِ طبیعیات تھا' اپنی کتاب کے مقدمے میں کہتا ہے: ''انسان کتابِ طبیعت کے مطالعے کے لیے اپنی بھرپور مساعی کے باوجود اب تک اسکی ابجد ہی سے آشنا ہو سکا ہے۔'' یعنی اگر ہم طبیعت کو ایک عظیم طبی کتاب سے تشبیہ دیں جسے علمی بنیاد پر لکھا گیا ہے' تو جس شخص نے ابھی الف ب پڑھنا ہی سیکھا ہے' وہ اس کتاب سے کس قدر آشنا ہو سکتا ہے؟ آج کا انسان طبیعت کے رازوں سے بس اسی قدر آشنا ہوا ہے۔ فرض کیجیے ایک ایسا بچہ جس نے ابھی حال ہی میں اسکول جانا شروع کیا ہے اور اُسے حروفِ تہجی یاد کرائے گئے ہیں' وہ صرف حروف کو پہچان سکتا ہے۔ اس بچے اور اُس شخص کا درمیانی فاصلہ کیا ہوگا جو ابن سینا کی قانون جیسی کتاب

کا مطالعہ کرسکتا ہے' اسکے مضامین کو سمجھ سکتا ہے' اسکی گتھیوں کو سلجھا سکتا ہے؟ دنیا کا یہ عظیم طبیعیات داں' جس کا ہماری صدی میں بے جان طبیعت سے شناسائی میں کوئی مثل نہیں' وہ کہتا ہے کہ انسان نے ابھی طبیعت کی محض ابجد پڑھنا سیکھی ہے' اُس نے جتنا علم حاصل کیا ہے بس وہ یہی ہے۔ پس کبھی ہمارے مطالعے کا موضوع وہ کتاب ہوتی ہے جسے اپنی بھرپور ذکاوت کے ساتھ سعدی یا فردوسی نے تالیف کیا ہے' اپنی تمام تر ذہانت کے ساتھ ابن سینا نے تالیف کیا ہے' اور کبھی مطالعے کا موضوع طبیعت ہوتی ہے۔

ایسی کتاب جو انسان کی تالیف ہو' آخر کار ایک حل (solve) ہو سکنے والی کتاب ہے۔ بوعلی کی شفا جس میں اس قدر ابہامات ہیں اُس کے باوجود آخر کار ایسے اساتید مل جاتے ہیں جو اُسے مکمل طور پر حل کر لیتے ہیں۔ معروف میرزا جلوہ' فلسفۂ بوعلی کے استاد تھے' شفا میں ایک دو مقامات ایسے تھے جنہیں میرزا جلوہ حل کرنے سے قاصر تھے۔ کہتے ہیں کہ جب علی محمد باب سامنے آیا' تو میرزا جلوہ نے کہا: میں اس نئے نبی سے کوئی معجزہ طلب نہیں کرتا' بوعلی کی شفا کے چند مقامات ایسے ہیں جنہیں میں حل نہیں کر سکا ہوں' وہ فقط اُنہیں حل کر دے' اگر اُس نے وہ حل کر دیئے' تو میں اُس پر ایمان لے آؤں گا۔

لیکن ایک ایسا مسئلہ جسے انسان اُٹھاتا ہے' آخر کار وہ حل ہو جاتا ہے۔ خود بوعلی نے بعض مسائل اُٹھائے' لیکن بعد میں یہ اعتراف کیا کہ میں اُنہیں حل نہیں کر سکا' بعد میں آنے والے اُنہیں حل کریں گے۔ ''شوق و عشق مادّہ بہ صورت'' کے مسئلے میں وہ کہتے ہیں کہ میں تو اِسے حل کرنے سے قاصر رہا ہوں' بعد میں آنے والے اسے حل کریں گے' اور صدرالمتالہین آتے ہیں اور آ کر اُسے حل کرتے ہیں۔ شیخ انصاری اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود مکاسب میں مسئلہ ''تعاقب ایدی'' کے سلسلے میں قاصر رہتے ہیں' بعد کی صدیوں میں آنے والے بعض محققین اُسے حل کرتے ہیں۔ لیکن طبیعت کا معاملہ اس طرح کا نہیں ہے' انسان کسی ایسے مقام پر نہیں پہنچ سکتا جہاں وہ یہ کہہ سکے کہ بحمداللہ میں نے کائنات کی تمام گتھیاں سلجھالی ہیں اور اب کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہی۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔

طبیعت سے قرآن کی مشابہت

قرآن کتاب ہے' دوسری طرف ایک تحریر ہے' کلام ہے' اُسی طرح جیسے گلستانِ سعدی بھی کلام ہے' بوعلی کی شفا بھی کلام ہے' فردوسی کا شاہنامہ بھی کلام ہے۔ البتہ {قرآن} ایسا کلام ہے جس کا متکلم خدا ہے' انسان نہیں۔ اس اعتبار سے وہ طبیعت کی مانند ہے۔ جس نے قرآن کو وجود بخشا ہے' اُسی نے طبیعت کو وجود بخشا ہے۔ قرآن میں سعدی کی گلستان' بوعلی کی شفا اور فردوسی کے شاہنامے جیسی خاصیت نہیں پائی جاتی' اُس میں طبیعت کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ جس پر تدبر وتفکر اور جس سے استفادہ ہر دور کے انسان پر فرض ہے۔

اہلِ یورپ کا ایک عمدہ جملہ ہے' وہ کہتے ہیں: ''حقیقت وہ ہے جو مستقبل میں آنے والے کہیں گے۔'' یعنی حقیقت دریافت کرنے میں انسان ہمیشہ آگے کی جانب گامزن ہے (ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ انسان نے جو کچھ بعد کے زمانے میں کہا ہے اُس میں کوئی غلطی نہیں پائی جاتی اور جو کچھ پہلے دور میں کہا گیا تھا اُس سے بہتر ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے' انسان غلطی بھی کرتا ہے' لیکن مجموعی طور پر بہرحال اسی طرح ہے) انسان مسلسل ایک راہ پر گامزن ہے' وہ حقائق کو بتدریج پہلے سے زیادہ دریافت (Discover) کر رہا ہے۔ مجموعی طور پر اپنے سفر کو اِس انداز سے جاری رکھے ہوئے ہے کہ کبھی ایک حقیقت کو دریافت کرتا ہے' بعد میں اِس سے منحرف ہو جاتا ہے' اور اسکے سو سال' دو سو سال' پانچ سو سال یا ہزار سال بعد پھر اُسی جگہ واپس پلٹ آتا ہے' اپنی اُسی پہلی بات پر۔ البتہ ایک ذرا بلند سطح پر آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ طبعی حقائق کے بارے میں ہے۔

قرآن کی کیا صورت ہے؟

کیا قرآن کے حقائق وہی ہیں جو ذہین ترین مفسرین نے ہزار سال پہلے بیان کیے تھے؟ بس وہی ہیں جو شیخ طوسی کی تبیان' طبرسی کی مجمع البیان' زمخشری کی تفسیرِ کشاف اور امام فخر رازی کی تفسیرِ کبیر میں بیان ہوئے ہیں؟ یا قرآن کا خالق' اسے وضع کرنے والا اور اس کا مدوِّن وہی ہے جو طبیعت کا خالق' وضع کرنے والا اور مدوِّن ہے' جس طرح طبیعت کے متشابہات اور محکمات ہیں اور تدریجاً اُس کے معمے اور مسائل (Problems) حل (Solve) ہو رہے ہیں'

اور انسان تدریجاً طبیعت کے حقائق سے آشنا ہو رہا ہے' قرآن بھی اسی طرح سے ہے۔

پس مسئلۂ خاتمیت کا چوتھا رکن' اجتہاد کی بنیادوں کی وسعت اور اُن کا لامتناہی ہونا' ہردم اُن کا تازہ اور سدا بہار ہونا ہے۔

قرآن کا سدا بہار ہونا حدیث کی روشنی میں

حدیث میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: مَا بَالُ الْقُرآنِ لَایَزِیدُ بِالنَّشْرِ وَالدِّرَاسَةِ اِلَّاغَضَاضَةً؟ کیا وجہ ہے کہ قرآن کا جتنا بھی مطالعہ کیا جائے اور اس پر جتنا بھی تدبر کیا جائے' اسکی طراوت اور تازگی بڑھتی ہی جاتی ہے؟ امامؑ نے فرمایا: لِاَنَّهُ لَمْ یُنْزَلْ لِزَمَانٍ دُونَ زَمَانٍ وَلَالِنَاسٍ دُونَ نَاسٍ' وَلِذٰلِکَ فَفِی کُلِّ زَمَانٍ جَدِیدٌ وَعِنْدَ کُلِّ نَاسٍ غَضٌّ. (۱) یعنی اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن ایک معین زمانے اور معین لوگوں کے لیے نازل نہیں ہوا ہے' بلکہ یہ ہر زمانے اور ہر دور کے لوگوں کے لیے ہے' لہٰذا ہر زمانے میں نیا اور ہر دور کے لوگوں کے لیے تازہ رہتا ہے۔

قرآن ایک چشمے کی مانند ہے جس سے مسلسل پانی لیتے رہنے اور پیہم اس کا آب جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام اپنے اُن جملوں میں جنہیں ہم نے گفتگو کے آغاز میں پڑھا تھا' یوں فرماتے ہیں: وَاعْلَمُوا اَنَّ عِبَادَاللّٰهِ الْمُسْتَحْفَظِینَ عِلْمَهُ' یَصُونُونَ مَصُونَهُ. جان لو کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اپنے علم کا نگہبان قرار دیا ہے' وہ خدا کے راز کی حفاظت کرتے ہیں۔ وَیُفَجِّرُونَ عُیُونَهُ. اور خدا کے چشموں کو جاری کرتے ہیں' اور زیر زمین پانیوں کو باہر نکالتے ہیں۔ (اسکے بعد وہ خود اُن لوگوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں' جو اگرچہ ہماری بحث سے خارج ہے لیکن ہم آپ کے لیے اُس کا ترجمہ کرتے ہیں) یَتَوَاصَلُونَ بِالْوِلَایَةِ' وَیَتَلَاقَوْنَ بِالْمَحَبَّةِ. (ان دو جملوں میں اُن کے ایک دوسرے کے ساتھ روابط کی وضاحت کرتے ہیں) یعنی وہ لوگ جو حقیقت میں اسلام کے عالم ہیں' حقیقتاً خدا انہیں اس بات کی

۱۔ عیون اخبار الرضا۔ طبع سنگی۔ ص ۲۳۹

اجازت دیتا ہے کہ وہ مجتہد اور "وَتَصْيِيرِ كُلِّ فَرْعٍ اِلیٰ اَصْلِهٖ" {فروع کو ان کی اصل کی طرف پلٹانے} پر عمل پیرا ہوں' اُن میں اوّلین خاصیت یہ ہے کہ وہ محبت اور الفت رکھتے ہیں اور اُن کے درمیان قرب پایا جاتا ہے' وہ باہم مرتبط اور متصل ہیں' ایک دوسرے سے جدا نہیں' ایک دوسرے سے اُن کے روابط منقطع نہیں۔ يَتَوَاصَلُونَ بِالْوَلَايَةِ. اگر ولایت سے مراد محبت ہو' تو مطلب یہ ہوگا کہ محبت نے اُنہیں ایک دوسرے سے منسلک کیا ہوا ہے' اور اگر مقصود ولایتِ الٰہی ہو' تو معنی یہ ہوں گے کہ ولایتِ الٰہی نے اُنہیں' ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے۔ وَيَتَلَاقَوْنَ بِالْمَحَبَّةِ. جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں' تو دو عاشقوں اور دو معشوقوں کی طرح ہوتے ہیں' ایک دوسرے کی جانب کشش محسوس کرتے ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات سے اُن کے دل نہیں اکتاتے' اور نہ ہی آگے چلنے اور پیچھے چلنے میں ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ وَيَتَسَاقَوْنَ بِكَأْسِ رَوِيَّةٍ. "سقی" کے مادّے سے "تساقی" کے معنی سیراب ہونے کے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ جاموں کا تبادلہ کرنا۔ ایک دوسرے کے جاموں سے سیراب ہوتے ہیں' ان میں سے ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ میں نے فلاں حقیقت کو دریافت (Discover) کیا ہے' تمہیں بتاتا ہوں' دوسرا اس سے کہتا ہے کہ میں نے فلاں حقیقت کو دریافت کیا ہے' تمہیں بتاتا ہوں۔ ان میں سے ایک دوسرے کے نورِ علم سے استفادہ کرتا ہے' ایک دوسرے کو روشنی دیتا ہے' اور دوسرا اسے منور کرتا ہے۔ ان میں سے ایک اپنے تیار کردہ جام سے دوسرے کو پلاتا ہے' اور دوسرا اپنے تیار کردہ جام سے پہلے کو پلاتا ہے' وہ ایک دوسرے کو سیراب کرتے ہیں۔ وَيَصْدُرُونَ بِرِيَّةٍ. سیراب اور سیر ہو کے باہر نکلتے ہیں۔ لَا تَشُوبُهُمُ الرِّيبَةُ. اُن کے وجود میں شک وشبہ داخل نہیں ہو پاتا۔ وَلَا تُسْرِعُ فِيهِمُ الْغِيبَةُ. ان کے درمیان غیبت کا گزر نہیں ہوتا' وہ ایک دوسرے کی غیبت اور ایک دوسرے کے بارے میں بدگوئی نہیں کرتے۔ عَلَىٰ ذٰلِكَ عَقَدَ خَلْقَهُمْ وَ اَخْلَاقَهُمْ' خدا نے ان کے اخلاق وعادات کو اسی طرح سنوارا ہے۔ فَعَلَيْهِ يَتَحَابُّونَ وَ بِهٖ يَتَوَاصَلُونَ' پس ان میں پائی جانے والی خدا کی محبت نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔ ان کے کاموں کی بنیاد خدا ہے' خدا ہے جس نے انہیں باہم مربوط اور

متصل کیا ہے۔ فَكَانُوا كَتَفَاضُلِ الْبَذْرِ يُنْتَقَى فَيُؤْخَذُ مِنْهُ وَيُلْقَى 'قَدْ مَيَّزَهُ التَّخْلِيصُ' وَهَذَّبَهُ التَّمْحِيصُ. ان کی مثال منتخب کردہ بیجوں کی سی ہے۔ کسان جب فصل کاشت کرنا چاہتا ہے' تو ہر بیج کو نہیں بوتا' بلکہ بہترین بیج تلاش کرتا ہے اور انہیں کاشت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ یہ لوگ اسی قسم کے ہیں۔ قَدْ مَيَّزَهُ التَّخْلِيصُ 'وَهَذَّبَهُ التَّمْحِيصُ. (۱) تلخیص اور تمحیص شدہ ہیں' یہ بہترین انتخاب ہیں۔ یہ حضرت کے جملوں کا تتمہ تھا۔

غرض یہ کہ: کیونکہ قرآن کتاب الٰہی ہے' کتاب طبیعت کی حیثیت رکھتی ہے' ہر دور اور ہر زمانے کے مسلمین اور مومنین کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ لہٰذا جس طرح قرآن تمام مسلمانوں کو طبیعت میں تدبر و تفکر کا حکم دیتا ہے' اور انہیں تدبر و تعقل کی ترغیب دیتا ہے' اسی طرح خود اپنے بارے میں بھی تاکید کرتا اور ترغیب دیتا ہے' اور کہتا ہے کہ تم جتنا زیادہ قرآن کا مطالعہ کرو گے اتنا ہی بہتر اسکے حقائق تک رسائی حاصل کرو گے۔ ہم اس بارے میں بزرگان دین کے جملوں کو پیش کریں گے' تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ خود بزرگان دین نے ابتدا ہی سے قرآن کو ہم سے اسی طرح متعارف کرایا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک معروف خطبہ ہے' جس کا ایک حصہ ہم یہاں آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ خطبہ ''کافی'' میں موجود ہے اور میرے خیال میں عین اسی صورت میں اہل سنت کی کتب میں بھی پایا جاتا ہے۔ ہم اہل سنت کی کتب کو بطور تائید اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ اگر ایک حدیث کو شیعہ اپنے طرق سے اور اہل سنت اپنے طرق سے نقل کرتے ہوں' جبکہ ان دونوں فرقوں کا طرق ایک دوسرے سے جدا ہو' تو وہ حدیث زیادہ قابل اعتماد ہوتی ہے' حتماً صحیح اور معتبر ہے اور یقیناً پیغمبر اکرمؐ سے صادر ہوئی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جملوں کی ابتدا میں فرماتے ہیں: إِذَا الْتَبَسَتْ عَلَيْكُمُ الْفِتَنُ فَعَلَيْكُمْ بِالْقُرْآنِ. جب کبھی تمہیں فتنوں کا سامنا ہو' اور تم پر معاملہ مشتبہ ہو جائے' تو {ایسے موقع پر} قرآن سے رجوع کرو۔ وَهُوَ كِتَابُ تَفْصِيلٍ وَبَيَانٍ وَتَحْسِينٍ.

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۱۴

قرآن ایسی کتاب ہے جو تفصیل دیتی اور بیان کرتی ہے۔ وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ. قرآن میں کوئی غیر سنجیدہ اور ہلکی بات نہیں پائی جاتی ہے۔ لَهُ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ. یعنی اسکی پشت بھی ہے اور شکم بھی اور ایک دوسری روایت کی تعبیر کے مطابق: لَهُ ظاهِرٌ وَ باطِنٌ. {قرآن} ظاہر بھی رکھتا ہے اور باطن بھی۔ فَظاهِرُهُ حِكْمَةٌ وَباطِنُهُ عِلْمٌ. قرآن کا ظاہر حکمت اور ظاہری دستورِ عمل ہیں اور قرآن کے باطن سے علم اُبلتا ہے۔ ظاهِرُهُ اَنيقٌ وَباطِنُهُ عَميقٌ. قرآن کا ظاہر زیبا اور اس کا باطن سمندر کی سی گہرائی کا مالک ہے۔ لَهُ نُجومٌ وَعَلى نُجومِهِ نُجومٌ. یا لَهُ تُخومٌ وَعلى تُخومِهِ تُخومٌ. مجموعی طور پر (اب چاہے نُجومٌ ہو یا تُخومٌ) مراد یہ ہے کہ قرآن کے درجات ومراتب ہیں، اسکے ظاہر سے ایک معنی سمجھ آتے ہیں، لیکن اگر آپ اسکی گہرائی میں ایک درجے اُتریں، تو وہاں ایک بالکل نئی حقیقت کا سامنا کرتے ہیں، مزید ایک درجے گہرائی میں اُتریں، تو وہاں بھی ایک بالکل نئی حقیقت اپنے سامنے پاتے ہیں۔ (لا تُحصىٰ عَجائِبُهُ وَلا تُبلى غَرائِبُهُ. اسکے عجائب شمار نہیں کیے جاسکتے اور اسکی تازگیاں باسی نہیں ہوتیں) فيهِ مَصابيحُ الْهُدىٰ وَمَنارُ الْحِكْمَةِ وَدَليلٌ عَلَى الْمَعْروفِ لِمَنْ عَرَفَ الصِّفَةَ. اس کتاب میں ہدایت کے چراغ ہیں، اس میں نورِ حکمت کے منار ہیں۔ ایسا شخص جو صفت کو پہچانتا ہو، اُسکے لیے معروف پر دلیل ہے۔ اس جملے کے بارے میں بہت سی بحثیں کی گئی ہیں، ہم ان کی تفصیل پیش نہیں کر سکتے، فقط اس خطبے کا ایک اور جملہ عرض کرتے ہیں: فَلْيَجْلُ جالِ بَصَرَهُ. (۱) اب جبکہ یہ کتاب ایک میدان کی سی حامل ہے، پس وہ شخص جس کے پاس آنکھیں ہیں، جو چشمِ بصیرت کا مالک ہے، اُسے چاہیے کہ اپنی آنکھیں کھولے اور اس کتاب میں غور وفکر کے گھوڑے دوڑائے۔

اس حوالے سے ہمارے پاس بہت سی احادیث واخبار موجود ہیں، جو آج کی رات پیش نہیں کیے جاسکتے۔ انشاء اللہ آئندہ مجلس میں اُن احادیث واخبار کو پیش کریں گے جو بتاتی ہیں کہ قرآن ہر زمانے میں تازہ ہے اور ہر دور میں تفکر وتدبر کا موضوع ہے، سمندر ہے اور اس سمندر سے

۱۔ اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۵۹۹

جتنے بھی موتی نکالے جائیں موتی نکلنے کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

یہ مسئلۂ خاتمیت کے ارکان میں سے ایک علیحدہ رکن ہے۔ یعنی قرآنِ کریم کی وہ لامتناہی اور کبھی نہ ختم ہونے والی صلاحیت جس کے تحت اُس سے مسلسل نئے نئے حقائق کا استخراج اور استنباط کیا جاسکتا ہے۔

نواں خطاب

قرآن وسنت کی لامتناہی استعداد

نواں خطاب

قرآن وسنت کی لامتناہی استعداد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُلِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ.... اَعُوۡذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

"اِنَّ ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَھۡدِیۡ لِلَّتِیۡ ھِیَ اَقۡوَمُ۔"(۱)

گزشتہ ہفتے ہماری گفتگو ختم نبوت کے باب میں ہمارے پیش کردہ چوتھے رکن کے بارے میں تھی۔ یہ چوتھا رکن یہ تھا کہ فکرِ اسلامی کے منابع (Sources) بے پایاں استعداد کے مالک ہیں' محدود' ختم اور تمام ہونے والے نہیں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ انسان کے مطالعے اور اُسکے تفکر کا موضوع قرار پانے کے اعتبار سے بہت سی چیزیں محدود (Limited) ہیں' انسان اِن کے اندر ایک حد تک غوروفکر کے ذریعے اِن کی گہرائی' باطن اور اِن کی تمام تہوں تک جا پہنچتا ہے' اور اِسکے بعد اِن میں غوروفکر کی کوئی گنجائش اور ضرورت باقی نہیں رہتی' جیسے وہ آثار جنہیں خود انسان وجود میں لاتا ہے۔

لیکن کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ انسان جتنا بھی اُن پر غوروفکر کرے' اُن پر مزید زیادہ سے زیادہ غوروفکر کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ طبیعت (Nature) ایسی ہی چیزوں میں سے ہے۔ یقیناً دو ڈھائی ہزار سال پہلے تک انسان کو طبیعت شناسی کے بارے میں اپنے جہل کا اِس قدر

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۹ {بے شک یہ قرآن اس راستے کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے}

احساس نہیں تھا' جس قدر آج علوم کی اِس قدر ترقی کے باوجود اُس میں یہ احساس پایا جاتا ہے۔ ڈھائی ہزار سال پہلے کے حکما اور فلاسفہ بہت زیادہ دوٹوک انداز میں اس کائنات کے موجودات اور اِن موجودات کے حقائق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا کرتے تھے۔ آج کے دانشمند کئی ہزار سال پہلے کے دانشمندوں سے کہیں زیادہ اپنے آپ کو طبیعت کے بارے میں جاہل اور لاعلم سمجھتے ہیں۔

اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں کہ آئن اسٹائن کتاب ''خلاصۂ فلسفۂ نسبیت'' کے مقدمے میں کہتا ہے کہ: ''شاید یہ بات کہی جا سکے کہ انسان نے اپنی کئی ہزار سالہ جدوجہد کے بعد کتاب طبیعت پڑھنے کی ابجد دریافت کر لی ہے' حال ہی میں اُسے پتا چلا ہے کہ یہ کتاب کن حروفِ تہجی سے لکھی گئی ہے۔'' ایک بچہ جس نے تازہ تازہ الف ب سیکھی ہو اُس نے کتاب کو کتنا پڑھا ہوگا؟ وہ تو ابھی کچھ بھی نہیں جانتا' اور اُسے کچھ سمجھ نہیں کہ کتاب میں کیا نکات اور موضوعات ہیں' اُس نے ابھی ابھی الف ب سیکھی ہے اسکے بعد وہ پڑھنا سیکھے گا اور کتاب پڑھے گا۔ جی ہاں' وہ چیز جو خدا کی مخلوق ہے تعجب نہیں کہ انسان اسکی قرائت میں اس حد تک ناتواں ہو۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ وہ کبھی اسکی کسی بھی چیز کو نہیں پڑھ سکے گا' البتہ رفتہ رفتہ اسکے ایک ایک حصے کو پڑھ لے گا۔

آسمانی کتاب قرآن جو خاتم الانبیا کا علمی معجزہ ہے' اُس میں اور تمام دوسری آسمانی کتابوں میں فرق یہ ہے کہ جس ہستی پر یہ نازل ہوئی ہے' اُس کا اعجاز بھی ہے۔ یعنی ہر پیغمبر کا اعجاز اُس پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب نہیں ہے' اُس کا معجزہ ایک چیز ہوا کرتی تھی اور اُس پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب ایک علیحدہ چیز۔ صرف خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جن پر نازل ہونے والی کتاب ایک آسمانی کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کا معجزہ بھی ہے۔ اسکی وجہ بھی واضح ہے۔ کیونکہ آپ کے دین کو باقی رہنا ہے' اس لیے آپ کے معجزے کو بھی باقی رہنا چاہیے۔ کسی سنگریزے کا تسبیح کرنا' کسی عصا کا اژدھے میں بدل جانا' کسی بڑے سے پتھر کا ایک عظیم الجثہ حیوان میں تبدیل ہو جانا' وہ چیزیں ہیں جنہیں صرف وہی لوگ دیکھتے ہیں جو اُس زمانے اور اُس مقام پر موجود ہوں' بعد میں یہ چیزیں تاریخ میں نقل ہونے والی باتوں کے بطور باقی رہ جاتی

ہیں' کوئی ان پر یقین کرتا ہے کوئی نہیں کرتا۔ لیکن ایک علمی معجزہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔

صدی بہ صدی قرآن کی بہتر تفسیر کی گئی ہے

ممکن ہے ہمارے درمیان ایک فکر پائی جاتی ہو اور وہ یہ کہ قرآن اور حدیث کو ماضی کے لوگ زیادہ بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ آج آنے والا ہر فرد {قرآن وحدیث کو} ماضی کے ہر فرد سے بہتر سمجھتا ہے۔ اگر ہم بشریت کو مجموعاً ایک اکائی کے طور پر پیش نظر رکھیں' تو قرآن کی تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قرآن اور اسلام کی آمد کے بعد ہر آنے والی صدی میں {قرآن وحدیث کو} پچھلی صدی کے مقابلے میں بہتر طور پر سمجھا گیا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے انسان جوں جوں آگے بڑھا ہے اپنے سے پہلے انسانوں کے مقابلے میں اس نے طبیعت کو بہتر سے بہتر سمجھا ہے۔

کیا اس بات کی پیش گوئی خود قرآن میں موجود ہیں؟

یہاں دو نکات پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا یہ بات اسلام کے ابتدائی دور میں کہی جاتی تھی کہ اسلام کو آئندہ آنے والے تم سے بہتر سمجھیں گے؟ دوسری بات یہ کہ وہ کیا نکات ہیں جن کی جانب ہم اشارہ کر سکتے اور جن کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ صدیوں میں اِن نکات کو لوگ حل نہیں کر سکے تھے لیکن بعد کی صدیوں میں اُنہیں بہتر طور سے سمجھا گیا ہے۔ پس سر دست اس بارے میں ہمارے پاس دو نکات ہیں۔

پہلا نکتہ: گزشتہ ہفتے ہم نے قرآنِ کریم کے بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک (نسبتاً تفصیلی) حدیث آپ کی خدمت میں پیش کی تھی' اس حوالے سے اور بھی احادیث ہیں۔ ہمارے پاس اِس مضمون پر متعدد اخبار و احادیث موجود ہیں کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن' اور اُس کا باطن بھی سات باطنوں تک کا حامل ہے۔ بعض اخبار میں ہے کہ: ظَاهِرٌ وَباطِنٌ اور بعض دوسرے اخبار میں ہے کہ: ظَهْرٌ وَبَطْنٌ. ظاہر جسے تمام لوگ درک کرتے ہیں اور باطن جس تک فقط کچھ ہی لوگ پہنچتے ہیں' اُس باطن کے بھی باطن ہیں' یعنی وہ لوگ جو اُس باطن تک پہنچ جاتے ہیں' تو اُن میں سے کچھ لوگ تو اسی مرحلے تک رہ جاتے ہیں اور کچھ لوگ اس سے بھی

آگے بڑھ جاتے ہیں اور اُس باطن کے بھی مزید سات باطن ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: ''قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔''(۱) ان سات حروف سے کیا مراد ہے، مفسرین نے اس بارے میں کیا کیا بحثیں کی ہیں۔ محققین کا کہنا ہے کہ ان سات حروف سے مراد اس بنیاد پر کہ (رسولؐ نے فرمایا ہے کہ قرآن) سات بطن اور سات باطن رکھتا ہے، ایک ہی مقصد ہے، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، ایک سے زیادہ معنی نہیں ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ مرحوم آیت اللہ بروجردیؒ کی قم تشریف آوری کے پہلے سال اُن کے اصول کے درس میں {ایک موقع پر} بحث اس نکتے پر آ پہنچی کہ ایک ہی لفظ کو ایک سے زیادہ معنی میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مراد یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس ایک دوسرے سے مختلف اور جدا معنی کا حامل ایک لفظ ہو، جیسے فارسی زبان کا لفظ شیر، تو کیا اس لفظ کا ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہونا ممکن ہے، یا نہیں؟ وہ لوگ جو اس بات کے مدعی ہیں کہ ایک لفظ کو ایک ہی وقت میں کئی معنی میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اُنہوں نے ایک استدلال اسی حدیث سے کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: ''قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔'' اُن کا دعویٰ ہے کہ پیغمبر کی مراد یہ ہے کہ قرآن میں ایک ہی لفظ ایک ہی وقت میں کئی مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔

البتہ یہ وہ بات ہے جسے علما قبول نہیں کرتے۔

مرحوم آیت اللہ بروجردیؒ نے اپنے اُس درس کے اسی مقام سے وعظ کا آغاز کیا، اس طرح انہوں نے درس کی تکمیل بھی کی اور ضمناً وعظ بھی کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ ہم بہت سے دعوں کو قبول نہیں کرتے، اُنہیں کھوکھلا اور بے معنی سمجھتے ہیں (اُن کی مراد وہ فضول قسم کے دعوے ہیں جو بعض صوفی حضرات قرآن کے بطون کے بارے میں کیا کرتے ہیں) لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ فہمِ قرآن سے وہ مراد نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں، مراد اس سے کہیں گہری ہے، پھر انہوں نے اُسی نکتے کی وضاحت فرمائی کہ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور اس ظاہر کو سب درک

۱۔ نَزَلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ.

کر سکتے ہیں' ایک معلم قرآن کے ظواہر کو سمجھ سکتا ہے' لیکن انسان اپنے اندر موجود کمالات کے تناسب سے اُن لفظی معانی سے ماوراء معانی درک کر سکتا ہے جنہیں عام افراد درک کرتے ہیں۔ اسکے بعد اُن کا کہنا تھا کہ انسان کے مراتب جوں جوں کامل تر ہوتے جاتے ہیں اُسی نسبت سے وہ قرآنِ کریم کے زیادہ سے زیادہ معنی درک کرتا چلا جاتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور ہی سے یہ بات پیشِ نظر تھی کہ یہ تصور نہ کیا جائے کہ قرآن کے معانی بس وہی ہیں جو صدرِ اسلام کے عرب درک کیا کرتے تھے' اور ہمیں بس یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ لوگ قرآن سے کیا سمجھا کرتے تھے' قرآن کی اُس سے زیادہ کوئی مراد نہیں ہے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے' قرآن صرف اُن لوگوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا۔ قرآن تو تا قیامِ قیامت تمام بشریت کے لیے نازل ہوا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآن کی اپنی خواہشِ نفسانی اور رجحان کے مطابق تفسیر کرے' لیکن سب کو قرآن میں تدبر و تفکر کا حق حاصل ہے۔ اور جب تک دنیا قائم ہے' لوگوں کو {قرآن میں} تدبر کا حق حاصل ہے اور اُن کے لیے اپنے تدبر کے ذریعے {قرآن} سے تازہ نکات دریافت کرنے کا امکان موجود ہے' ایسے نکات جن تک ماضی کے لوگ اپنے تدبر و تفکر کے ذریعے نہ پہنچے ہوں۔

کافی میں ایک حدیث ہے جو کہتی ہے: خداوندِ تبارک وتعالیٰ جانتا ہے کہ آخری زمانے میں ایسی اقوام اور ایسے گروہ آئیں گے جو مُتَعَمِّقُونَ (فِی اللّٰہِ) {ہوں گے}' جو خدا اور الٰہیات میں گہرا غور و خوض کریں گے' یعنی مسائل کی گہرائیوں میں داخل ہوں گے' اسی لیے اُس نے سورۂ حدید کی ابتدائی آیات' سورۂ توحید اور سورۂ حشر کی آخری آیات نازل فرمائیں۔ یعنی اگر خدا کے علم میں ہوتا کہ آخری زمانے میں الٰہیات میں گہرا سوچ بچار کرنے والے افراد پیدا نہیں ہوں گے' تو وہ ان آیات کو نازل نہیں کرتا۔ یعنی اُس دور کے لوگ انہیں درک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے' یہ مستقبل میں آنے والے لوگوں کے لیے ہیں۔ اور واقعاً اگر کوئی الٰہیات اور معارفِ اسلامی کا جائزہ لے اور صدی بہ صدی اِن کا مطالعہ کرے' تو وہ دیکھے گا کہ ساتوں صدی' آٹھویں صدی' دسویں صدی اور اسکے بعد سے معارفِ الٰہی سے تعلق رکھنے والے افراد توحید کے مسائل

میں اپنے آپ کو سورۂ حدید کی ابتدائی آیات اور سورۂ توحید سے ہم آہنگ کر سکے ہیں۔ یعنی اُن سے پہلے کے لوگوں کے لیے یہ آیات ناقابلِ فہم اور ناقابلِ حل تھیں۔

یہ تو تھا قرآنِ کریم کے بارے میں۔

پس پتا چلتا ہے کہ صدرِ اسلام سے اور صدرِ اسلام میں یہ پیش گوئی کی جاتی تھی۔ کبھی بھی کسی اسلامی دانشمند کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ہمیں کیا حق کہ ہم تدبر و تعقل کریں اور نئے نئے نکات کی جستجو میں رہیں' بس حرفِ آخر وہی ہے جسے ہمارے بزرگ کہہ گئے ہیں۔ جی ہاں' بزرگوں کی حیثیت اور عظمت اپنی جگہ لیکن ان کی عظمت قرآن کی عظمت کے برابر نہیں۔

کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا (اور کسی نے یہ دعویٰ کیا بھی نہیں ہے) کہ حالیہ صدی کے ماہرین طبیعت کی ذہانت افلاطون' ارسطو اور سقراط و بوعلی سینا سے زیادہ تھی۔ لیکن سب اس بات کو مانتے ہیں کہ جو کچھ انسان نے تدریجاً حاصل کیا ہے اُس کا اُس سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا جو اُن لوگوں نے حاصل کیا تھا۔ ایک عالم نے اِس حوالے سے ایک خوبصورت مثال پیش کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ: علوم کی پیشرفت کے اعتبار سے علما کی مثال اُن انسانوں جیسی ہے جو ایک دوسرے کے کاندھوں پر سوار ہو کر افق کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایک انسان' چاہے وہ کتنا ہی طویل قامت ہو' فرض کیجیے دو میٹر قد کا مالک ہو' ایک شخص صحرا کے درمیان کھڑا ہو جائے اور گردن اُٹھا کے بہت دور تک دیکھنے کی کوشش کرے۔ ایسا شخص اِس سے زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتا جتنا ایک دو میٹر طویل شخص دیکھ سکتا ہے۔ ایک اور شخص آ کر اُس پہلے شخص کے کاندھے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بعد میں آنے والے اِس شخص کا قد پہلے والے شخص کے قد سے کم ہو لیکن کیونکہ وہ پہلے شخص کے کاندھے پر کھڑا ہے' اِس لیے یقیناً زیادہ دور تک دیکھ پائے گا۔ اِسی طرح اگر تیسرا شخص آئے اور دوسرے نمبر پر آنے والے اُس شخص کے کاندھے پر کھڑا ہو جائے' تو وہ مزید زیادہ دور تک دیکھ سکے گا۔

پس مسئلہ یہ نہیں ہے کہ سب سے پہلے آنے والے شخص کا قد سب سے زیادہ تھا یا دوسرے یا تیسرے نمبر پر آنے والے شخص کا' بلکہ بات یہ ہے کہ دوسرے نمبر پر آنے والے شخص نے سب

سے پہلے آنے والے شخص کے کاندھے سے استفادہ کیا اور تیسرے نمبر پر آنے والے شخص نے دوسرے نمبر پر آنے والے شخص کے کاندھے سے اور اسی طرح سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔۔۔

علما اسی طرح ہیں۔ ایک مسئلے پر سب سے پہلے تحقیق کرنے والا محقق' خواہ وہ جس قدر بھی ذہین ہو' اُس پہلے بلند قامت شخص کی مانند ہے' وہ ایک حد تک افق کو دیکھتا ہے' دوسرا آنے والا اُسکی فکر اور معلومات سے استفادہ کرتا ہے اور کچھ زیادہ صلاحیت کے ساتھ کام کا آغاز کرتا ہے۔ پس درحقیقت وہ اُس پہلے شخص کے کاندھے پر کھڑا ہے' کیونکہ اس نے اُس کی معلومات سے استفادہ کیا ہے' جبکہ تیسرا شخص پہلے اور دوسرے شخص کی معلومات سے اور چوتھا شخص تیسرے' دوسرے اور پہلے شخص کی معلومات سے اور اسی طرح آگے آنے والے افراد پہلے جا چکنے والے ہر فرد کی معلومات سے مستفید ہوتے ہیں۔ قرآنی حقائق کے انکشاف اور فہم کے مسئلے میں بھی بات اسی طرح ہے۔

یہ تو بات تھی قرآن کے اعتبار سے۔

سنت کی لامتناہی استعداد

سنت کے حوالے سے صورتحال کیا ہے؟

کیا اسکے بارے میں بھی صدر اسلام میں وہی پیش گوئی کی گئی تھی؟

جی ہاں' اُسی طرح کی پیش گوئیاں کی گئی تھیں' اور ہماری نگاہ میں خود یہی پیش گوئیاں اسلام کے اعجاز اور اُسکی بصیرت کی عظیم مثالیں ہیں۔

وہ اخبار و احادیث جن کی روایت شیعہ اور سنّی دونوں نے کی ہے' اُن میں ہمیں ایسے مضامین ملتے ہیں جن میں پیغمبر اکرمؐ خاص طور پر تاکید کرتے ہیں' اور فرماتے ہیں کہ: ''تم لوگ مجھ سے جو جملے اور مضامین سنتے ہو' انہیں تحریر کر لیا کرو اور انہیں بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے نقل کر لیا کرو۔ بہت سی باتیں جو تم نقل کرتے ہو' اُن سے تمہاری سمجھ میں بہت زیادہ باتیں نہیں آتیں' جبکہ بعد میں آنے والے لوگ انہیں تم سے بہتر سمجھیں گے۔''

مجھے یاد ہے یہ جملہ میں نے شیعہ کتب کافی اور تحف العقول میں دیکھا ہے اور یقینی طور پر

اہلِ سنت کی کتب سنن ابی داؤد یا صحیح مسلم یا صحیح بخاری میں بھی دیکھا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ مَقالَتی فَوَعاها وَبَلَّغَها مَنْ لَمْ یَسْمَعْها۔ (۱) ''خدا اُس بندے کو خوش وخرم رکھے جو میرے کلام کو سنے اور اُسے محفوظ رکھے۔'' پیغمبر اکرمؐ خاص طور پر تاکید کرتے ہیں کہ جو کچھ مجھ سے سنو اُسے لکھ لو۔ اُکْتُبوا عَنّی۔ بحارالانوار میں رسولِ اکرمؐ کے بہت سے اخبار نقل کیے گئے ہیں، جن میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ: ''تم لوگ مجھ سے جو باتیں سنتے ہو اُنہیں تحریر کرلیا کرو۔''

عرب کے لوگ جاہل اور اَن پڑھ تھے، اُن کے درمیان بہت کم لوگ ایسے تھے جنہیں لکھنا آتا تھا، اور رسولِ اکرمؐ کا اُنہیں یہ شوق اور رغبت دلانا دو چیزوں کی بنیاد بنا، ایک یہ کہ اِس نے لوگوں کو علم ودانش اور لکھنے پڑھنے کی جانب متوجہ کیا اور اُن میں کتاب اور لکھنے پڑھنے کی جانب شوق پیدا ہوا، اور دوسرے یہ کہ صدرِ اسلام ہی سے قرآن اور حدیث دونوں ہی کتابوں کی صورت میں محفوظ اور تحریر کیے جانے لگے۔ گو کہ احادیثِ نبوی کو خلیفۂ دوّم کے ایک اقدام کی وجہ سے نقصان اُٹھانا پڑا۔

حضرت عمر بن خطاب نے احادیثِ پیغمبر لکھنے کی ممانعت کردی تھی، وہ کہتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر لوگ پیغمبر کی احادیث لکھنے اور انہیں محفوظ کرنے میں لگ گئے، تو کہیں قرآن کی حفاظت اور اُسے تحریر کرنے کی جانب سے غافل نہ ہوجائیں، یا کہیں حدیث کو قرآن کے ساتھ خلط ملط نہ کردیں۔ اِسی بنا پر انہوں نے حدیث کی ترویج کرنے کی بجائے اُس کا راستہ روکا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت کم لوگوں نے رسولِ خداؐ کے حکم کی تعمیل میں اپنے حافظے یا اپنی تحریروں میں (احادیثِ نبوی کو) محفوظ کیا۔ آخر کار پیغمبرؐ کے حکم کے مقابلے پر خلیفہ کا حکم اِس قدر مؤثر نہیں ہوسکتا تھا، اور وہ بھی کسی ایسے کام کے بارے میں جس کا تعلق علما اور دانشوروں کے طبقے سے ہو۔ عمر بن عبدالعزیز جو سن ۹۹ ہجری میں خلیفہ بنے اور افسوس کہ اُن کی خلافت دو سال سے زیادہ نہ رہ سکی اور خود بنی امیہ نے اُنہیں اِس سے ہٹایا، اُنہوں نے اپنی والدہ کی جانب سے اپنے جد خلیفۂ ثانی کی اِس روش کو

۱۔ اصولِ کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۰۳

منسوخ کیا اور حکم دیا کہ احادیثِ پیغمبر کو لکھا اور محفوظ کیا جائے اور ان کے بھلا دیے جانے کی روک تھام کی جائے۔

بہرحال رابطہ قطع نہیں ہوا' جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ احادیثِ نبوی کو نقصان پہنچا لیکن ایسا نہیں ہوا کہ وہ مکمل طور پر ختم ہو جائیں۔ نہیں' وہ اس مرحلے تک نہیں پہنچیں۔ ہم جو شیعہ ہیں ہمارے پاس ائمہؑ کے ذریعے پہنچنے والی احادیث موجود ہیں' ائمہ اطہارؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میراث کے بہترین محافظ ہیں' اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارے علاوہ اہلِ سنت نے بھی اپنے طریقوں سے جو بکثرت احادیث نقل کی ہیں اُن کی ہمارے ائمہؑ نے بھی تائید کی ہے۔ پس اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بہت بڑی مقدار میں احادیثِ نبویؐ باقی رہی ہیں۔

بہرکیف پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ مَقالَتی فَوَعاها' خدا اُس بندے کو خوش وخرم رکھے جو میرا کلام سنے اور اُسے محفوظ رکھے۔ (وعی یعنی حفاظت اور نگہداری) وَبَلَّغَها مَنْ لَمْ یَسْمَعْها. اور ایسے لوگوں تک پہنچائے جنہوں نے اُسے نہیں سنا ہے۔

یہاں تک لوگوں کو صرف اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ وہ میرے کلام کو محفوظ کریں اور اُسے بعد میں آنے والی نسلوں تک پہنچائیں۔ ہمارا استدلال اس حدیث کے دوسرے حصے سے ہے۔ ایک انتہائی عجیب جملہ ہے۔ ایک مادہ پرست انسان بھی مستقبل میں آنے والے لوگوں کا فریضہ واضح کرنے کے سلسلے میں آنحضرت کی ذہانت اور بصیرت کو داد دیے بغیر نہ رہ سکے گا۔ آپؐ نے فرمایا: رُبَّ حامِلِ فِقْهٍ غَیْرِ فَقیهٍ' وَرُبَّ حامِلِ فِقْهٍ اِلی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ' یعنی بہت سے لوگ ہیں جو کسی فقہی بات کی حفاظت کرتے ہیں' جبکہ وہ خود فقیہ نہیں ہوتے' اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی فقہی بات کی دوسروں کے لیے روایت کرتے ہیں یا دوسروں کے لیے اُسے نقل کرتے ہیں جبکہ وہ دوسرے افراد ان سے زیادہ فقیہ اور زیادہ صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔

ہمارے آج کے زمانے میں لفظ ''فقہ'' کے معنی ہیں علمِ احکام' اور ہم ایسے شخص کو فقیہ سمجھتے ہیں جو نماز' روزے' جہاد اور حج وغیرہ سے تعلق رکھنے والے فرعی مسائل کا علم رکھتا ہو۔ لیکن سب ہی حتیٰ خود فقہا بھی یہ بات قبول کرتے ہیں کہ فقہ اپنی اصل اصطلاح میں ایک وسیع تر معنی کا حامل لفظ

ہے اس میں یہ (رائج) فقہ بھی شامل ہے اور دوسرے تمام اسلامی مفاہیم بھی۔ ''فقہ'' یعنی گہری سمجھ بوجھ۔ یہاں لفظ فقہ سے رسولِ خداؐ کی مراد ایک ایسا جملہ ہے جس میں گہری سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ رُبَّ حامِلِ فِقْهٍ غَيْرِ فَقِيهٍ' یعنی بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس ایک گہرا اور عمیق جملہ ہوتا ہے' جبکہ خود وہ لوگ گہرے فہم وشعور کے مالک نہیں ہوتے' اور اُن میں اتنی قدرت نہیں ہوتی کہ اس جملے کے معنی ومقصود اور اسکی گہرائی کو سمجھ سکیں۔ پس یہ جملہ اُن کے لیے بے سود ہوتا ہے۔ یہ لوگ بس اتنا کام کرتے ہیں کہ اس جملے کو زیادہ صلاحیت کے حامل لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ وَرُبَّ حامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ. بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ایک پُرمعنی جملے کی حفاظت کرتے ہیں' اور اُسے لے جا کر ایک ایسے فرد کے سپرد کرتے ہیں جو خود اس فرد سے بہتر اُسے سمجھتا ہے۔ آپ دیکھئے یہ حصہ اُس پہلے حصے کے بعد ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ: نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ مَقالَتى فَوَعاها وَبَلَّغَها مَنْ لَمْ يَسْمَعْها. خدا ایسے شخص کو خوش وخرم رکھے جو میرے کلام کو سنے اور اُسکی حفاظت کرے اور اُسے ایسے لوگوں تک پہنچائے جنہوں نے اُسے نہ سنا ہو۔ اسکے بعد فرماتے ہیں: بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس کوئی فقہی بات ہوتی ہے' جبکہ وہ خود فقیہ نہیں ہوتے' اور بہت سے ایسے لوگ جن کے پاس کوئی فقہی بات ہوتی ہے ایسے ہیں جو اس بات کو ایسے شخص کو منتقل کرتے ہیں جو خود ان سے زیادہ فقیہ' لائق اور دانا ہوتا ہے۔

اسی طرح رسولِ اکرمؐ کے کلمات میں سے یہ بھی ہے کہ: اُعْطِيتُ جَوامِعَ الْكَلِمِ. (۱) مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں۔ آنحضورؐ کہنا چاہتے ہیں کہ پروردگار کی طرف سے جو عظیم نعمتیں مجھے عطا کی گئی ہیں' اُن میں سے ایک نعمت جامع کلمات ہیں۔

جامع کلمات سے کیا مراد ہے؟

یعنی میں سو جملوں کی بجائے ایک جملہ کہہ سکتا ہوں' ہزار جملوں کی بجائے ایک جملہ کہہ سکتا ہوں' میں ایک قانون کی صورت میں یا ایک کلی اصول کی صورت میں ایک ایسا جملہ کہہ سکتا ہوں جس میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ جتنا چاہیں اسے توسیع دیں اور جتنا چاہیں اُسے پھیلائیں۔ میں

۱۔ بحارالانوار۔ ج ۶۔ طبع سربی تہران۔ ص ۲۲۹ نقل از امالی صدوق

ایسے جملے کہہ سکتا ہوں جو مختصر ہونے کے باوجود پوری انسانی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ ہیں اُعطیتُ جوامعَ الکلِم کے معنی۔ پیغمبر اکرمؐ سے ایسے جملے ہم تک پہنچے ہیں کہ جس موقع پر آپؐ نے وہ جملہ ارشاد فرمایا وہ بہت معمولی سا تھا' اور آپؐ اُس موقع پر اپنی بات بیان کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ لیکن اس موقع پر {اس جملے کے ذریعے} آپؐ نے ایک کلی اصول بھی بیان کر دیا' ایک ہمیشہ زندہ رہنے والا اصول۔

حدیثِ لاضرر

ایک شخص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے سمرہ بن جندب سے شکایت ہے' میری جس گھر میں رہائش ہے اُس میں سمرہ کا کھجور کا ایک درخت ہے' اور قاعدتاً اُسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ گاہ بگاہ اپنے درخت کو دیکھنے کے لیے آتا رہے' لیکن وہ ہمیشہ پہلے سے اجازت لیے بغیر آ جاتا ہے' اپنے آنے کی اطلاع نہیں دیتا' پہلے سے اجازت لے کر نہیں آتا' اچانک میرے گھر میں چلا آتا ہے' ایسی حالت میں آ جاتا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے بیوی بچوں کو اس حالت میں دیکھے۔ میں نے ہر طرح اُس سے کہہ کر دیکھ لیا کہ وہ پہلے سے اپنے آنے کی اطلاع دیا کرے' لیکن میری اس گزارش کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اُسے میرے پاس بلاؤ۔ جب وہ آ گیا تو حضورؐ نے فرمایا: اس شخص کو تم سے یہ شکایت ہے' اور تمہیں اسکے گھر میں داخل ہونے کے لیے' پہلے اس سے اجازت لینی چاہیے۔ اُس نے کہا: نہیں' اے اللہ کے رسولؐ میں اجازت نہیں لوں گا۔ پیغمبرؐ نے دیکھا کہ اس شخص کی اس صورت سے اصلاح نہیں ہو سکتی' لہٰذا آپؐ نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا اور اس سے فرمایا: چلو میں یہ درخت تم سے خرید لیتا ہوں اور اسکے عوض فلاں مقام پر اس سے بہتر درخت تمہیں دیتا ہوں۔ یہ بات بھی اُس نے قبول نہ کی۔ آپؐ نے فرمایا: میں تمہیں دو درخت دیتا ہوں۔ اس پر بھی وہ نہ مانا۔ آپؐ نے فرمایا: تین درخت دیتا ہوں۔ یہاں تک کہ آپؐ نے اُسے دس درختوں تک کی پیشکش کی' لیکن اُس نے یہ پیشکش بھی قبول نہ کی۔

بعض احادیث میں ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: میں تمہارے لیے جنت میں ایک درخت کی

ضمانت لیتا ہوں۔ اُس نے کہا میں کسی صورت نہ مانوں گا' مجھے صرف اپنا درخت چاہیے۔

اِس مقام پر نبی اکرمؐ نے اُس انصاری شخص کی طرف رُخ کیا اور فرمایا: جاؤ اور جا کر اِسکے درخت کو جڑ سے کاٹ کر اِسکے سامنے ڈال دو فَاِنَّهٗ لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ' اور بعض روایات میں ہے: لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ' اور بعض دوسری روایات میں ہے: لَاضَرَرَ وَلَاضِرَارَ عَلَی الْمُؤْمِنِ.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی ایک جملہ فقہا کے لیے ایک قاعدۂ کلی بن گیا' ایک ایسے قاعدے کی صورت اختیار کر گیا' جو پوری فقہ پر حکومت کرتا ہے۔ ہم نے ایک مقالے میں تحریر کیا ہے کہ اسلام قاعدۂ لاضرر اور قاعدۂ لاحرج کے ذریعے ویٹو (veto) کے حق کا قائل ہوا ہے۔ یہ بالکل ویٹو کے حق جیسا ہے۔ البتہ وہ ویٹو نہیں جو ایک بڑی طاقت کے نمائندے کے ذاتی رجحان اور پسند سے وابستہ ہے' بلکہ ویٹو کا وہ حق جس کی بنیاد ضرر و ضرار ہے' جس کی بنیاد ایک اہم ترین مصلحت ہے۔ جس طرح ایک بڑی طاقت کا نمائندہ ویٹو کا حق رکھتا ہے' اور دوسروں کے کیے ہوئے فیصلوں کو ویٹو کر دیتا ہے' اُسی طرح اسلام کا کسی بھی مقام پر کوئی بھی حکم جب ضرر و ضرار کی حد پر پہنچتا ہے' تو (قانونِ) لاضرار آ کر اُس کا راستہ روک لیتا ہے۔ فی الحال ہم ضرر و ضرار اور ان کے درمیان فرق اور لاضرر کے مفہوم کے بارے میں گفتگو کرنا نہیں چاہتے' کیونکہ یہ ایک طویل گفتگو ہے۔ بہرصورت ضرر و ضرار کا قاعدہ تمام اسلامی قوانین کو کنٹرول کرنے والا ایک قاعدہ ہے' وہ کنٹرول جسے خود اسلام نے اپنے نظامِ قوانین میں رکھا ہے۔ یہ ہیں اُعْطِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ کے معنی۔

غرری لین دین کی ممانعت

یا مثلاً ہماری فقہ میں ایک اور جملہ ہے' کہتے ہیں: نَهَی النَّبِیُّ عَنِ الْبَیْعِ الْغَرَرِ' یعنی پیغمبر اکرمؐ نے غرری سودے سے منع فرمایا ہے۔ غرر کس قسم کا سودا ہے؟ زمانۂ جاہلیت میں وہ کس قسم کے سودے تھے جن کی اِس جملے کے ذریعے ممانعت کی گئی ہے' اور کس قسم کے سودے آج ہو سکتے ہیں جنہیں یہ جملہ منسوخ کرتا ہے' اور انہیں منسوخ ہی کرنا چاہیے؟

ہم آپ کی خدمت میں اس کا ایک سادہ مفہوم بیان کرتے ہیں۔

اس جملے کے ذریعے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر سودے میں اس سودے کی تمام تفصیلات سودے میں شامل فریقوں پر واضح ہونی چاہئیں۔ یعنی خریدار کے سامنے پہلے ہی سے واضح ہونا چاہیے (یا اُس نے آنکھوں سے دیکھا ہو) اور اُسے ہر پہلو سے پتا ہونا چاہیے کہ وہ کیا چیز خرید رہا ہے' اور جو چیز وہ خرید رہا ہے وہ کن اوصاف وخصوصیات کی مالک ہے۔ وہ بے خبری اور اندھیرے میں سودا نہ کر رہا ہو اور اُس کا کیا ہوا سودا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نہ ہو۔ فروخت کرنے والا بھی جو قیمت حاصل کر رہا ہو' اُسکے لیے وہ قیمت واضح ہو' یا اُس نے اُسے دیکھا ہو اور سودا اندھیرے میں چلائے ہوئے تیر کی مانند نہ ہو۔

زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے درمیان رسم تھی کہ عام طور پر وہ اپنے سودوں کو چانس اور جوے (Gambling) کی شکل میں رکھتے تھے۔ مثلاً ایک شخص بھیڑوں کے ریوڑ میں سے (جس میں ظاہر ہے کہ تمام بھیڑ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے) کسی ایک بھیڑ کا سودا کرتا تھا' البتہ یہ بھیڑ ایک معین بھیڑ نہیں ہوتا تھا' بلکہ اس انداز سے ہوتا تھا کہ مثلاً سو بھیڑوں میں سے' جن میں ممکن ہے ایک بھیڑ کی قیمت پانچ درہم ہو' دوسرے کی دس درہم اور تیسرے کی پندرہ درہم' وہ اُن میں سے ایک بھیڑ دس درہم کا خرید لیتا اور پھر دور کھڑا ہو کر ریوڑ کی طرف ایک پتھر پھینکتا' یہ پتھر جس کسی بھیڑ کو لگتا' وہ بھیڑ دس درہم کے عوض اُس کا ہو جاتا۔ ممکن ہے اس بھیڑ کی قیمت پندرہ درہم ہو اور ممکن ہے پانچ درہم یا اس سے کم یا زیادہ۔ کس چیز کا سودا کیا جا رہا ہے وہ ابتدا ہی سے فریقین کے لیے واضح اور محدود نہیں ہوتی تھی' بس یہ سودا اتفاق پر منحصر ہوتا تھا۔ سودے کی کامیابی کا انحصار اسکے بارے میں معلومات پر نہیں ہوتا تھا' بلکہ سودے کی کامیابی یا ناکامی کا تعین چانس پر ہوتا تھا۔ اس قسم کا سودا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس قسم کے سودوں کو جو "بیع حَصاۃ" یعنی سنگریزے کے ذریعے سودے کے نام سے معروف تھے اور اسی طرح کے کچھ اور سودوں کو ممنوع قرار دیا' اور بطور کلی حکم دیا کہ سودوں میں "غَرَر" نہیں ہونا چاہیے۔ اور یہ خود ایک اصول بن گیا جس سے فقہا نے تمام ابواب مکاسب میں استفادہ کیا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اپنے ایک جملے کے ذریعے {لوگوں کے درمیان ہونے والے} سودوں کو اُس شکل سے نکال کر جس میں وہ اتفاق (Chance) سے وابستہ ہوتے تھے اور جس کے نتیجے میں فریقین ہمیشہ فکرمند رہتے تھے کہ اُنہیں فائدہ ہوگا یا نقصان' اُس حد میں قرار دیا جس میں سودے کی بنیاد تشخیص' علم اور اختیار پر ہو۔ اور اِسی بنا پر جو کام بھی چانس' قسمت اور اتفاق سے وابستہ ہو' وہ اسلام کی نظر میں جائز نہیں ہوسکتا۔ اسلام صرف اُس سودے اور معاملے کو جائز قرار دیتا ہے جو بصیرت کی روشنی میں طے پایا ہو اور جسے ممکنہ حد تک دیکھ بھال کر طے کیا گیا ہو' اس کا انجام اتفاق اور قرعہ کشی وغیرہ سے وابستہ نہ ہو' کیونکہ یہ باتیں سودے کو جوے سے قریب تر کردیتی ہیں۔

جوے کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو چانس اور اتفاق سے وابستہ ہوتا ہے' مجہول سے وابستہ ہے' اندھیرے میں تیر چلانا ہے۔

معارفِ اسلامی {کے باب} میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے جملے ارشاد فرمائے ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود' عارف کے لیے ایک انتہائی بلند عرفانی مفہوم کے' فلسفی کے لیے ایک بلند فلسفی مفہوم کے اور ایک عام انسان کے لیے واضح اور روشن مفہوم کے حامل ہیں۔ ہر طبقے کا انسان جب ان جملوں کو سنتا ہے' تو یہ سمجھتا ہے کہ ان کا مخاطب بس وہی ہے' صرف اسی کے لیے مفید ہیں۔ مثلاً یہ فرمان کہ: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ. (۱) جو اپنے آپ کو پہچانتا ہے' وہ اپنے رب کو پہچانتا ہے۔ یہ جملہ ایک عارف کے لیے' ایک ایسے فرد کے لیے جو معرفتِ شہودی کا دعویدار ہے ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ اہلِ عرفان و معرفت' ایک ایسی معرفت کے قائل ہیں جس کا نام اُنہوں نے معرفتِ شہودی رکھا ہے۔ حق کی معرفتِ شہودی کا راستہ معرفتِ نفس ہے' کیونکہ وہ تنہا موجود جس کی انسان معرفتِ حضوری رکھتا ہے وہ خود اس کا نفس ہے اور اگر انسان اپنے نفس کو اُس طرح درک کرلے اور اُس طرح اُسے پہچان لے جیسا کہ وہ ہے' تو یہ درک اور یہ شہود خدا کے شہود سے جدا نہیں ہے' ہو بہو ایک آئنہ ہے جو پہلے درجے میں اُسے ایک پتھر

۱۔ غرر الحکم و درر الکلم۔ فصل ۷۷۔ حدیث ۳۰۱

نظر آتا ہے' لیکن اگر وہ اسے اپنے سامنے رکھ لے اور غور سے اُس میں جھانکے تو اُس میں اپنی صورت دیکھتا ہے۔ یہ ایک عارف کی نظر سے اسکے معنی ہیں۔

لیکن اگر ایک فلسفی کی نظر سے: ایک فلسفی دیکھتا ہے تو دنیا کو سراسر تغیر پذیر پاتا ہے' اُسے دنیا میں کوئی چیز ثابت نہیں دکھائی دیتی۔ اسکے باوجود وہ دیکھتا ہے کہ نظام عالم ثابت ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ متغیر اپنے ساتھ کسی ثابت کو نہیں رکھ سکتا۔ دنیا متغیر ہے' بہتے پانی کی طرح۔ اور اگر آپ اس مسلسل متغیر اور بہتے پانی میں ایک ثابت نقش کو دیکھیں' تو سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ثابت نقش اُس بہتے اور ہر دم متغیر پانی سے تعلق نہیں رکھتا' یہ ثابت نقش لازماً کسی دوسری جگہ سے یہاں آیا ہے۔

گشت مبدل آب این جو چندبار عکس ماہ وعکس اختر برقرار

''اس ندی کا پانی تو کئی بار بدل چکا ہے' لیکن اس میں نظر آنے والے چاند اور ستارے کا عکس یوں ہی برقرار ہے۔''

انسان کا بدن پانی کے اسی دریا کی مانند ہے' مسلسل تغیر وتبدل کی حالت میں ہے۔ بدن کے بعض خلیے (Cells) خود مر جاتے ہیں اور اُن کی جگہ نئے خلیے آ جاتے ہیں۔ بعض خلیے ایسے ہیں کہ خود وہ خلیے نہیں مرتے' لیکن اُن کا بدن مسلسل غذا لیتا ہے' رطوبتیں جذب کرتا ہے اور فالتو چیزوں کو خارج کرتا ہے' یعنی اُن کا بدن خود انسان کے بدن کی مانند مسلسل تغیر وتبدل کی حالت میں ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہمارے بدن میں کوئی ثابت اور مستقل مادّہ نہیں پایا جاتا' اسکے باوجود ہم اپنی زندگی کے برسہابرس ایک ثابت اور مستقل شخصیت کے مالک رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم وہی ہیں جو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں تھے اور ہم وہی ہم ہیں جو آج سے چالیس سال پہلے تھے' اُس سے علیحدہ اور جدا نہیں' ہمارے بدن کا نظام بھی وہی نظام ہے' جس کسی نے ہمیں ماضی میں دیکھا ہوتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ہمارا جسم وہی جسم ہے' ہماری آنکھیں وہی آنکھیں ہیں' ہماری ابروئیں وہی ابروئیں ہیں۔ وہ فرسودہ سے فرسودہ ہو جاتی ہیں لیکن نظام نہیں بدلتا۔ پس: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ. اس جملے سے ایک عام فرد بالکل دوسرا مفہوم لیتا ہے۔

✿✿✿

دسواں خطاب

منابع اسلامی کی لامتناہی صلاحیت

دسواں خطاب

منابع اسلامی کی لامتناہی صلاحیت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.... اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

"کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَ لِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ."(۱)

ہم ختمِ نبوت سے تعلق رکھنے والی گفتگو کے چوتھے حصے میں ہیں۔ہم نے انسان اور معاشرے کے بارے میں اِس اعتبار سے گفتگو کی کہ انسان اور معاشرے میں کونسے پہلو ثابت اور مستقل اور کونسے پہلو متغیر اور مسلسل تغیر پذیر ہیں۔ہم نے اسلامی قوانین اور ان قوانین کی کیفیت کے بارے میں گفتگو کی کہ کس طرح {ان میں} قواعد اور اصول پائے جاتے ہیں اور کس طرح {ان میں} فرعی قوانین کا ایک سلسلہ بھی موجود ہے۔ہم نے علم اور عالم' اجتہاد اور دینی مسائل میں علمی تخصص (Specialization) اور خاتمیت کے دور میں اِس طبقے پر عائد ہونے والے فرائض کے بارے میں بھی اپنے عرائض پیش کیے۔

۱۔سورۂ ص ۳۸۔آیت ۲۹ {یہ ایک مبارک کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تاکہ یہ لوگ اسکی آیتوں میں غور وفکر کریں اور صاحبانِ عقل نصیحت حاصل کریں}

چوتھا موضوع جو اس وقت ہماری گفتگو کا مرکز ہے وہ منابع اسلامی کا مسئلہ ہے۔ یعنی تحقیق اور مطالعے کے سلسلے میں اسلامی منابع (Sources of Islam) اور اس میں بھی درجۂ اوّل پر قرآن کریم کی لامتناہی صلاحیت۔ مراد یہ ہے کہ کسی بھی زمانے کو قرآن کریم میں تحقیق اور مطالعے کا آخری دور تصور نہیں کیا جا سکتا' اور انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس عظیم آسمانی کتاب میں ہے اُس نے وہ سارا کا سارا دریافت (Discover) کر لیا ہے' اور اس حوالے سے اُسکی کوئی بات مجہول نہیں رہنے دی ہے۔

گزشتہ مجلس میں ہم نے اس بارے میں کچھ گفتگو کی تھی کہ بنیادی طور پر صدرِ اسلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہ نکتہ پیش نظر رہا تھا کہ انسان پر جتنا وقت گزرے گا وہ اُتنا ہی اسلام اور دین کے حقائق سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوتا چلا جائے گا۔ یعنی کسی کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ پیغمبرؐ کے زمانے میں زندگی بسر کرنے والے لوگ قرآن اور کلامِ پیغمبر کو یعنی کلامِ پیغمبر اور قرآن کریم کے معنی اور اُن کی گہرائیوں کو بعد میں آنے والے لوگوں سے بہتر سمجھتے تھے اور اُنہیں ان کی گہرائیوں کا زیادہ علم تھا۔ اسکے برعکس رسولِ اکرمؐ نے صریحاً فرمایا ہے کہ ممکن ہے بعد میں آنے والے لوگ میرے جملوں کے معنی اور مقصود کو بہتر طور پر سمجھیں' لہٰذا اسی بنا پر آپ لوگوں کو رغبت دلاتے تھے کہ تم لوگ جو کچھ مجھ سے سنتے ہو اُسے درست اور ٹھیک محفوظ کرو اور اسے آئندہ آنے والوں کے لیے نقل کرو' کیونکہ شاید تم جن لوگوں کے لیے نقل کرو وہ میرے مقصود کو تم لوگوں سے بہتر طور پر سمجھیں۔

ابوحنیفہ اور اعمش کی داستان

ایک معروف حکایت ہے' کہتے ہیں کہ: سلیمان اعمش' جو اہلِ سنت کے محدثین میں سے ایک ہیں' اُنہوں نے اپنے زمانے کے فقہا میں سے کسی سے ایک مسئلہ دریافت کیا' اُس فقیہ نے مسئلے کا جواب دیا۔ جواب سن کر انہوں نے پوچھا: اپنے اس جواب کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے اور آپ کو کیسے پتا چلا کہ مسئلے کا یہ جواب ہے؟ اُس نے کہا کہ اُس روایت کے ذریعے جو خود تم نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کی ہے' اُس روایت سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ پھر جب اُس فقیہ نے اپنا

استدلال پیش کیا' تو اعمش نے دیکھا کہ وہ درست کہتا ہے۔ اِسکے بعد اعمش نے اُس سے ایک اور مسئلہ پوچھا اور اُس نے اُس کا بھی جواب دیا۔ اعمش نے کہا: اِسکی تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ اُس نے کہا کہ ایک اور روایت اور اِس روایت کو بھی خود تم ہی نے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کیا ہے' اُس روایت سے بھی یہ نکتہ حاصل ہوتا ہے۔ جب اعمش نے سوچ بچار کیا اور اُس کا استدلال سنا تو دیکھا اسکی یہ بات بھی درست ہے۔ اِس پر اُس نے یہ جملہ کہا: اَنْتُمُ الْاَطِبَّاءُ وَنَحْنُ الصَّیادِلَةُ. (۱) وہ بولا: ہم محدثین اور تم اہلِ نظر کی مثال دوا فروش اور طبیب کی سی ہے' ہم صرف دوائیں بنا کر تمہارے حوالے کر سکتے ہیں لیکن طبابت اور اِس بات کی تشخیص کہ یہ دوا کس بیماری کے لیے مفید ہے اور کس مریض کے لیے اسے لکھنا چاہیے تمہارا کام ہے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ خود میں جو ان احادیث کا ناقل ہوں' ان احادیث کے معنی اور مفہوم کو تمہاری طرح نہیں سمجھ سکتا' اور ان کے مقامات پر انہیں تطبیق نہیں دے سکتا لیکن تمہاری وضاحت کے بعد اب وہ اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی ہیں۔

بہر حال ہم نے وعدہ کیا تھا کہ آج کی رات' جو اِس موضوع پر گفتگو کی ہماری آخری رات ہے اور آج ہم اِس گفتگو کا اختتام کر رہے ہیں' اِس پہلو پر گفتگو کریں گے کہ تاریخ کا بہاؤ اِس سلسلے میں کس بات کی نشاندہی کرتا ہے؟ یہ قرآن جو چودہ سو سال سے ہر علم اور فن کے دانشوروں' علما اور محققین کے ہاتھوں میں ہے' اور وہ اِس کا مطالعہ اور اِس میں تدبر و تفکر کر رہے ہیں' کیونکہ خود قرآن نے لوگوں کو تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا. (۲) اور ایسے لوگوں کی ملامت کی ہے جو اِس کتاب میں تدبر نہیں کرتے: کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (۳)

۱۔ عیون اخبار الرضا۔ طبع سنگی۔ ص ۲۳۹

۲۔ سورۂ محمد ۴۷۔ آیت ۲۴ (تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی غور نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں)

۳۔ سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۲۹ (یہ ایک مبارک کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے' تاکہ یہ لوگ اسکی آیتوں میں غور و فکر کریں اور صاحبانِ عقل نصیحت حاصل کریں)

فلسفے اور سائنس میں قرآن کا تدریجاً بڑھتا ہوا نفوذ

کوئی صدی ایسی نہیں گزری جس میں اس کتاب کریم کی دسیوں بلکہ سینکڑوں تفاسیر نہ لکھی گئی ہوں۔ یہ اُن خصوصی موضوعات کے علاوہ ہے جو تفسیر کے علاوہ اس کتاب {قرآن} کی روشنی میں لکھی گئی کتب میں مطالعے اور تحقیق کا مرکز رہے ہیں۔ بہر حال اگر آپ فقہ کا مطالعہ کریں تو آپ کو پوری فقہ میں جگہ جگہ آیاتِ قرآنی نظر آئیں گی اگر آپ اخلاق کا مطالعہ فرمائیں تو اتنی بہت سی لکھی گئی اخلاقی کتب میں آپ کو جا بجا قرآنی آیات دکھائی دیں گی جنہیں بطور سند و شہادت پیش کیا گیا ہے اگر آپ الٰہی فلسفے کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ صدر اسلام سے جوں جوں وقت آگے کی طرف بڑھا ہے ہر دور میں الٰہی فلسفے کے اندر قرآن کے نفوذ میں اضافہ ہوا ہے یعنی قرآن نے اس میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بنائی ہے خود اسکی ایک تاریخ ہے۔ {اسی طرح} علم کلام میں اپنے مقام پر عرفان میں اپنے مقام پر حتیٰ شعر و ادب میں بھی صدی بہ صدی اسلام کی تاثیر اور نفوذ میں اضافہ ہوا ہے۔

عربی اور فارسی ادب کے مضامین کا ایک حصہ قرآن پر مشتمل ہے۔ ایران کے موجودہ دور کے فارسی ادب کے اساتید میں سے ایک استاد اپنی لکھی ہوئی ایک کتاب میں کہتے ہیں کہ: جب آپ فارسی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں وہاں آپ کو قرآن کی اخلاقی تعلیمات اور احکامات میں سے کوئی چیز نظر نہیں آتی، لیکن جوں جوں زمانہ آگے کی طرف بڑھا ہے (عربی ادب کو تو جانے دیجیے) فارسی ادب پر قرآن کا نفوذ بڑھتا چلا گیا ہے۔ مثلاً آپ ''رودکی'' کو جو چوتھی صدی کے اوائل سے تعلق رکھتا ہے نظر میں رکھیے اور سعدی کو جو ساتویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں (چہ جائیکہ جامی اور ہاتف اصفہانی جیسے لوگ جو بعد کی صدیوں سے تعلق رکھتے ہیں) کو دیکھئے تو سعدی (کے آثار) میں ''رودکی'' سے زیادہ قرآن کا نفوذ ہے اور کلی طور پر عرض ہے کہ جتنا جتنا زمانہ گزرا ہے اتنا ہی فارسی شعر و ادب پر قرآن کے نفوذ میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔

ہم بیان یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان تمام ادوار میں اس کتاب {قرآنِ کریم} پر غور و خوض اور اس کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ جب آپ حساب لگاتے ہیں اور ان تمام مختلف شعبوں کا جائزہ لیتے

ہیں {تو دیکھتے ہیں کہ} جس قدر کسی بھی فن سے تعلق رکھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے اتنی ہی قرآنی معنی کی بہتر سے بہتر تشریح ہوئی ہے اور وہ بہتر طور پر کشف ہوئے ہیں۔

قرآن اور توحید

آپ مسئلۂ توحید اور اس سے مربوط مسائل کو فرض کیجئے' صفاتِ خدا سے مربوط مسائل' صفاتِ ثبوتی و صفاتِ سلبی' قضا و قدر سے مربوط مسائل' جبر و اختیار سے مربوط مسائل' آپ ہزار سال پہلے کے غیر معمولی افراد مثلاً شیخ صدوقؒ کی کتابوں کا جائزہ لیجئے' اسکے بعد آگے بڑھیے اور بڑھتے ہوئے خود اپنے اس زمانے سے قریبی صدی تک آیئے اور دیکھئے کہ علمِ توحید نے بہت زیادہ ترقی کی ہے' آپ دیکھیں گے کہ توحید کے ترقی یافتہ علم کے مقابل (اس بارے میں) شیخ صدوقؒ کی توجیہ و تفاسیر بچکانہ نظر آتی ہیں۔ انسان تعجب کرتا ہے کہ آخر یہ مردِ بزرگ توحید کے بارے میں آیاتِ قرآن کی توجیہ و تفسیر سے کیوں عاجز رہا ہے؟! مثلاً وہ صفاتِ خدا کا ذکر کرتے ہیں' حتیٰ صفاتِ ثبوتیہ کو صفاتِ سلبیہ پر پلٹاتے ہیں۔ قرآن میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ' اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ. شیخ صدوقؒ اسے صحیح طرح سے حل نہیں کر پاتے' کہ یہ علیم خدا کے جلال اور قدسِ الوہیت کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر واقعی معنوں میں خدا پر صادق آسکے۔ کہتے ہیں: (اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ) اَیْ لَيْسَ بِجَاهِلٍ. "خدا علیم ہے' عالم ہے" یعنی جاہل نہیں' اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ صفاتِ ثبوتی کو صفاتِ سلبی پر پلٹاتے ہیں: قَدِيْرٌ اَیْ لَيْسَ بِعَاجِزٍ' حَيٌّ اَیْ لَيْسَ بِمَيِّتٍ' (وہ صاحبِ قدرت ہے' یعنی عاجز و ناتواں نہیں ہے' وہ زندہ ہے' یعنی مردہ و بے جاں نہیں ہے) سب کچھ صفاتِ سلبی کی طرف پلٹاتے ہیں۔ اسکے معنی عجز و ناتوانی ہیں۔ البتہ اگر ہم بھی اُن کے زمانے میں ہوتے' اور اُس دور میں علمِ توحید نے جتنی پیشرفت کی تھی اُسی حد میں ہوتے' تو اس سے بہتر نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس قسم کی توجیہات طلبہ کے بقول ایک طرح سے اکل از قفا (پیچھے کی طرف سے ہاتھ گھما کے کھلانا' یعنی: گھما پھرا کر بات کرنا) ہے' جب توحید کے بارے میں تحقیقات میں اضافہ ہوگا' تو پتا چل جائے گا کہ اس قسم کی توجیہات اور تاویلات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

جب ہم قضا و قدر کا جائزہ لیتے ہیں' جبر و اختیار کا مطالعہ کرتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک

شجاعت وصراحت کے ساتھ پوری کائنات پر خداوندِ عالم کے ارادۂ عام اور فاعلیتِ عام کو بیان کررہے ہیں۔ جتنا جتنا علم توحید آگے بڑھا ہے' اُس نے اپنے آپ کو اس منطق سے نزدیک پایا ہے' اور دیکھتا ہے کہ معاملہ اُسی طرح ہے جیسے قرآن نے کہا ہے۔ ماضی میں توجیہ وتاویل اور ان باتوں کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی تھی' لیکن اب بالکل احساس نہیں ہوتا۔

قرآن اور حقوقِ نسواں

اگر آپ فقہ اور فقہی مسائل میں داخل ہوں تو وہاں بھی معاملہ ہو بہو اسی طرح ہے۔ ہم نے اپنے زیرِ مطالعہ چند خصوصی موضوعات میں اس بات کو قریب سے محسوس کیا ہے اور آج کے لوگوں کی اصطلاح میں انہیں لمس کیا ہے۔ ان میں سے ایک حقوقِ نسواں کا موضوع ہے۔ جب انسان اس مسئلے کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور اس موضوع پر بڑے عرصے تک اپنا وقت صرف کرتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ قرآن کی ایک خاص منطق ہے' اُس نے کسی اور منطق کی پیروی نہیں کی ہے' قرآن میں عورت وہی عورت ہے جو خلقت میں عورت ہے' قرآن میں کوئی افراط وتفریط نہیں۔ نہ وہ قدیم تفریطی منطقیں ہیں جو عورت کے بارے میں ایک خاص قسم کے افکار رکھتی ہیں (قرآن میں ایسی کوئی بات سرے سے موجود ہی نہیں ہے' ہم مسلمانوں کے درمیان موجود ہے لیکن قرآن میں موجود نہیں' قرآن میں ایک دوسری منطق ہے) اور نہ ہی وہ افراطی باتیں ہیں جو آج کہی جاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خلقت کو فراموش کردینا چاہتے ہیں (ایسی باتیں بھی قرآن میں نہیں ہیں)۔

اگر ہم سے خواہش ظاہر کی جائے کہ ہم دانشور حلقے کے سامنے عورت کے بارے میں کوئی ایسی کتاب پیش کریں جس میں بیان کی جانے والی تمام باتیں قابلِ ذکر ہوں اور اُن کا دفاع کیا جاسکتا ہو' تو اس مقصد کے لیے ہمارے پاس خود قرآن سے بہتر کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ ہزار سال پہلے کی اور ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے کی تمام سنّی اور شیعہ کتب کو لے آیئے' ان میں سے کوئی بھی کتاب خود قرآن سے زیادہ آج کے محققین کے سامنے پیش کیے جانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ شیخ طوسی کی کتب میں سے' جن میں انہوں نے متنوع مسائل پر اپنی آراء دی ہیں' کسی کتاب کو پیش

نہیں کیا جاسکتا' پوری کی پوری ''جواہر'' کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ واحد کتاب جو پوری کی پوری پیش کیے جانے کی صلاحیت رکھتی ہے' وہ قرآن ہے۔ یہاں سے انسان کو سمجھ آتی ہے کہ یہ کتاب ہر زمانے میں اُس زمانے سے کس قدر آگے اور تقدم کی مالک ہے۔

جب انسان قرآن کا مطالعہ کرتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ وہ ایک خاص منطق رکھتا ہے۔ اس کے بعد احادیث کا مطالعہ کرتا ہے' تو وہاں دیکھتا ہے کہ یہ احادیث قرآن سے بقول ایک شباہت سی رکھتی ہیں' لیکن ایک درجے نیچے ہیں۔ یہ ایک بشری رنگ اختیار کر لیتی ہیں (۱)۔ فقہ کی طرف آیئے' دیکھتے ہیں کہ فقہ حتیٰ احادیث سے بھی چنداں برابر نہیں' مزید ایک درجے نیچے نظر آتی ہے۔ لوگوں اور اُن کے عمل کی جانب آیئے' وہاں بھی دیکھتے ہیں کہ لوگوں کا عمل حتیٰ فقہ کے مطابق بھی نہیں ہوتا۔

یہ اس کتاب کے زندہ ہونے کی علامت ہے' جو کہتی ہے کہ ہر زمانے میں تمہارا عمل جس قدر بھی آگے بڑھ جائے' میرے اندر تحقیق اور مطالعے کی اتنی ہی ضرورت رہے گی۔ پچھلے لوگوں کو ملامت نہ کرو۔

ایک اور موضوع ''ربا'' کا موضوع ہے' جس کی وضاحت کا ہمارے پاس وقت نہیں' صرف اشارہ کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔ (۲)

۱۔ درست ہے کہ احادیث' پیغمبرؐ اور امامؑ کے فرامین ہیں' اور پیغمبرؐ و امامؑ اور خدا کے کلام میں کوئی دوئی نہیں ہے' لیکن ایک فرق ہے' خدا کے کلام کو ہم براہِ راست دیکھتے ہیں' آیاتِ قرآن وہی آیاتِ قرآن ہیں' لیکن احادیث' فلاں نے فلاں سے روایت کی ہیں اور فلاں نے فلاں سے۔ بالآخر سات آٹھ ہاتھوں سے گزری ہیں' اُس آبِ زلال کی مانند ہیں جو ندیوں اور نہروں سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اُس میں کچھ آمیزش نہ ہوئی ہو۔ فلاں نے فلاں سے' فلاں نے فلاں سے' فلاں نے فلاں سے' فلاں نے فلاں سے' آخر کار ان میں اپنے راویوں کے مزاج کا ایک رنگ شامل ہوتا ہے۔

۲۔ مطالعے کے خواہشمند حضرات استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ کی کتاب ''مسئلۂ ربا'' کی جانب رجوع کر سکتے ہیں۔

قرآن اور گزشتگان کی تاریخ وقصص

رہی بات تاریخی موضوعات کی۔قرآن تاریخ کی کتاب نہیں' لیکن جب اس نے کسی عبرت اور درس کو بیان کرنا چاہا ہے تو اس مناسبت سے کچھ موضوعات کا تذکرہ کیا ہے' جیسے داستانِ قومِ عاد' داستانِ (قومِ) ثمود' داستانِ قومِ سبا' داستانِ ذوالقرنین۔گزشتہ زمانوں کے لوگوں کے پاس ان داستانوں کے لیے قرآن کے علاوہ کوئی اور مدرک نہ تھا۔کیا یہ عجیب بات نہیں کہ انسان دیکھتا ہے کہ بیسویں صدی میں لوگ مثلاً قومِ سبا اور یمن کے تمدن کے بارے میں تحقیقات کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جو کچھ دریافت ہوتا ہے' وہ اُسکے مطابق ہوتا ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے؟ اسی طرح قومِ عاد اور قومِ ثمود کے بارے میں بھی ابھی حال ہی میں بعض یورپی حضرات نے آثارِ قدیمہ کی کھدائی کی بنیاد پر جو گہری تحقیقات کی ہیں اُن کے ذریعے ایسے مسائل سامنے آئے ہیں۔ایک ایرانی محقق' جو حقیقتاً بھی محقق ہے اور اہلِ یورپ بھی اس اعتبار سے اُسے انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس قسم کے مسائل کے بارے میں اُسکے پاس ہمیشہ تازہ ترین معلومات ہوتی ہیں' اُس نے چند برس پہلے کچھ کانفرنسیں منعقد کی تھیں' وہاں وہ کہتا ہے کہ: ان حوالوں سے جو تازہ ترین تحقیقات ہوئی ہیں وہ وہی (ثابت کرتی) ہیں جو قرآن میں آیا ہے۔

قرآن اور اخلاق

اگر ہم اخلاق کے موضوع کو مدِنظر رکھیں' تو یہ بھی ایک مفصل داستان ہے۔عالمِ اسلام میں صرف دو اخلاقی مکتب پائے جاتے ہیں' ایک اخلاقِ سقراطی' جس کی ایک خاص بنیاد پر تدوین وتنظیم ہوئی ہے' اور ایک اخلاقِ عرفانی' یعنی صوفیانہ اخلاق' اور اس دوسرے کا ہماری ادبیات پر زیادہ تسلط اور گہرا اثر ہے۔

سقراطی اخلاق کی اصل اور بنیاد منسوخ ہوا چاہتی ہے۔عارفانہ اور صوفیانہ اخلاق میں ایک بہت بڑا کمزور نقطہ موجود ہے' جو توجیہ وتفسیر کے لائق نہیں۔

قرآنِ کریم میں اخلاق کے حوالے سے جابجا ایسے بیانات آئے ہیں' جو اُس دور کے

لوگوں کے لیے قابلِ توجیہ نہیں تھے' یعنی وہ انہیں حل نہیں کر سکے ہیں' لیکن قرآن میں {وہ بیانات} موجود ہیں۔ مثلاً قرآن میں تہذیبِ نفس کے بارے میں' اور اس بارے میں کہ انسان کو خود خواہ اور خود پرست نہیں ہونا چاہیے نکات موجود ہیں۔ قرآنِ کریم میں خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کو مذموم قرار دیا گیا ہے: اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ۔ (۱)

قرآن کی نظر میں تزکیہ اور تہذیبِ نفس مطلوب' لازم اور فلاح و کامیابی کی شرط ہے: قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىهَا ۔ (۲) قرآنِ کریم میں نفس کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں ہے کہ نفس کی تطہیر' اصلاح اور اسے پاکیزہ کرو۔ لیکن اپنے اخلاقِ عارفانہ میں ہم ایک تعبیر دیکھتے ہیں کہ اگر یہ تعبیر قرآن میں ہوتی تو آج ہمارے پاس جواب نہ ہوتا' اور وہ ''نفس کُشی'' ہے۔ قرآن میں نفس کُشی کی بات نہیں ہے۔ اصلاً نفس کُشی' ان معنی میں کہ سچ مچ نفس کو مار ڈالا جائے' ممکن نہیں ہے' خواہ وہ نفسانی خواہشات ہوں' خواہ وہ انسان میں پائے جانے والے نفسانی تمایلات ہوں۔ وہ لوگ بھی جو یہ گمان کرتے ہیں کہ اُنہوں نے نفس کو مار دیا ہے' یعنی اُسے معدوم کر دیا اور اُس کا گلا گھونٹ دیا ہے' غلطی پر ہیں' وہ نفس جسے اُنہوں نے مارا تھا' وہ اُن کے باطن کے شعور میں سرگرمِ عمل ہے۔ اسلام نفس کو رام کرنے' مطیع کرنے اور اُسکی ریاضت کا طرفدار ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: وَاِنَّمَا هِیَ نَفۡسِی اَرُوضُهَا بِالتَّقۡوٰی لِتَاۡتِیَ اٰمِنَةً یَوۡمَ الۡخَوۡفِ الۡاَکۡبَرِ ۔ (۳) آپؑ کا ارشاد ہے: یہ میرا نفس ہے' میں تقویٰ کے ذریعے اِسکی ریاضت کرتا ہوں' اُسے تقویت دیتا ہوں' یہ ایک گھوڑے کی مانند ہے جسے سدھایا جاتا ہے' بقولِ اُسے راستے پر لے جاتے ہیں' تاکہ اُسے راہ و رفتار کی تعلیم دیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: شَیۡطَانِی اَسۡلَمَ بِیَدِی. آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے شیطان کو مار ڈالا ہے' اُس کا سر کاٹ دیا ہے' اور اُسے ختم کر ڈالا ہے' بلکہ فرمایا ہے: میرا شیطان (ہر انسان میں ایک شیطان ہوا کرتا ہے' جو

۱۔ سورۂ جاثیہ ۴۵۔ آیت ۲۳ {کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنا لیا ہے}

۲۔ سورۂ شمس ۹۱۔ آیت ۹ {بے شک وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنا لیا}

۳۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۴۵

اُس کا نفسِ امارہ ہوتا ہے) میرے ہاتھوں تسلیم ہو چکا ہے۔

اخلاقِ اسلامی میں تمام اخلاقی ملکات کے لیے ایک بنیاد اور جڑ کے عنوان سے ''عزتِ نفس'' کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ عزت و کرامتِ نفس وہ موضوع ہے جسے ہم نے اخلاق کی کسی بھی کتاب میں کم از کم ایک نمایاں اور ممتاز موضوع کے عنوان سے اور شاید کسی بھی عنوان سے نہیں دیکھا۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر مومن اپنی عزتِ نفس کے لیے اہمیت کا قائل ہو جائے گا' تو یہ خلافِ اخلاق ہے' خود پرستی ہے۔ لیکن قرآن مومن کو اپنی عزت و احترام کرنے اور اپنے آپ کو محترم سمجھنے کی دعوت دیتا ہے: وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ .(۱)

سماجی اور معاشرتی موضوعات کی بھی یہی صورت ہے۔ چند سو سال پہلے کے لوگ اجتماعی تفکر نہیں رکھتے تھے۔ انسان جب اس طرزِ تفکر سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ قرآن کی منطق کے مطابق ہے' تو حیرت میں ڈوب جاتا ہے' کیونکہ بنیادی طور پر قرآن امت اور جمعیت کے لیے وحدت کا قائل ہے' حیات کا قائل ہے' ممات کا قائل ہے' اجل اور اجل کے لیے معین وقت کا قائل ہے۔

یہ سب باتیں ہمارے سامنے اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آسمانی کتاب اس پہلو سے انسان کی تالیف کردہ ایک کتاب کی مانند نہیں ہے' بلکہ کتابِ طبیعت کی مانند ہے' اس میں ہمیشہ مستقبل میں آنے والے لوگوں کے لیے تحقیق کی بنیاد فراہم ہے۔

نہج البلاغہ اور اس کا اپنے زمانے سے آگے ہونا

حتیٰ نہج البلاغہ جو قرآن کے فرزندوں میں سے ایک ہے (وہ بھی اسی طرح ہے)۔ نہج البلاغہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی جمع آوری اور تدوین کو ہزار سال گزر چکے ہیں اور اُس زمانے کو جب اس کے خطبے ارشاد فرمائے گئے' تقریباً تیرہ سو پچاس سال بیت چکے ہیں۔ پہلے ہم اُن خطبات اور نصائح کو دیکھیں گے جن سے اس مدت کے دوران نہج البلاغہ سے استفادہ کیا گیا ہے'

۱۔ سورۂ منافقون ۶۳۔ آیت ۸ {اور ساری عزت اللہ' رسول اور صاحبانِ ایمان کے لیے ہے}

اسکے بعد خود اس کتاب کے مضامین اور مشمولات کا جائزہ لیں گے۔ اگر آپ اس وقت سے ہزار سال بعد تک کے خطبا' وعاظ اور شارحین کی گفتگوؤں کا مطالعہ کریں اور اپنے سے تیس سال پہلے تک آ پہنچیں' تو دیکھیں گے کہ نہج البلاغہ کی تعلیمات کے صرف ایک ہی حصے کی جانب اُن کی توجہ مرکوز ہوئی تھی اور جو اُن کے مزاج سے ہم آہنگ تھا' جبکہ دوسرے حصوں کے بارے میں سکوت اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تیس سال پہلے انسان جس کسی زبردست ترین خطیب کی تقریر سننے بیٹھتا' اور وہ خطیب نہج البلاغہ سے گفتگو کرنا چاہتا' تو نہج البلاغہ کے زہد پر مبنی خطبوں کے سوا کچھ اور سننے کو نہیں ملتا تھا' یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نہج البلاغہ بس زاہدانہ تعلیمات پر مشتمل انہی خطبات تک محدود ہے: دَارٌ بِالْبَلَاءِ مَحْفُوفَةٌ وَبِالْغَدْرِ مَعْرُوفَةٌ. (۱) اِنَّمَا الدُّنْيَا دَارُ مَجَازٍ' وَالْآخِرَةُ دَارُ قَرَارٍ' فَخُذُوا مِنْ مَمَرِّكُمْ لِمَقَرِّكُمْ. (۲) تَجَهَّزُوا رَحِمَكُمُ اللّٰهُ' فَقَدْ نُودِيَ فِيكُمْ بِالرَّحِيلِ. (۳)

وہ لوگ بھی جو نہج البلاغہ کے حافظ تھے' اگر نہج البلاغہ کو موضوع بنانا چاہتے تھے' تو وہ موضوعات جن پر وہ گفتگو کر سکتے تھے' نہج البلاغہ کے وہی زاہدانہ خطبات ہوا کرتے تھے' اور وہ اُن سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ یعنی نہج البلاغہ کے دوسرے حصوں پر گفتگو کا میدان اُن کے سامنے کھلا ہوا نہ تھا اور {اُن کا} طرزِ فکر اُنہیں {ان میدانوں میں جانے کی} اجازت نہ دیتا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ یہاں تک کہ حالیہ اجتماعی اور سماجی تغیرات رونما ہوئے' اور دنیا میں کچھ اجتماعی فلاسفہ پیدا ہوئے اور اجتماعی افکار کا ایک سلسلہ سامنے آیا۔ اور پھر سچ مچ ایک مرتبہ نہج البلاغہ کی رونق میں اضافہ ہوا اور نہج البلاغہ کی جانب توجہ بڑھی۔ پھر خطبا اور اُن کے علاوہ بھی دوسرے افراد میں آمادگی پیدا ہوئی کہ وہ مثلاً مالکِ اشتر کے نام امیر المومنینؑ نے جو مکتوب لکھا تھا اور اُس میں آپ نے جو اجتماعی اور سیاسی نکات جمع کیے تھے انہیں جملہ بہ جملہ بیان کریں اور اُن کی تشریح کریں۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۲۴

۲۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۰۱

۳۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۰۲

یہ نہج البلاغہ جو ہزار سال سے سب کے ہاتھوں میں ہے' اس مکتوب کو بھی ہزار سال ہو چکے ہیں' جب آپ دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ واقعی جملوں کے وہی معنی ہیں جو نہج البلاغہ میں تھے' اور کسی نے اُنہیں نہج البلاغہ سے منسوب نہیں کیا ہے' نہ اُس سے کوئی لفظ منسوب کیا گیا ہے اور نہ ہی کسی معنی کی توجیہ و تفسیر' لیکن افراد اور افکار میں آمادگی نہیں پائی جاتی تھی' باالفاظِ دیگر زمانہ {اسکے ذکر کی} اجازت نہیں دیتا تھا' لیکن آج زمانہ {اسکی} اجازت دیتا ہے۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا ہے اس کتاب (جو قرآنِ کریم کے فرزندوں میں سے ایک فرزند ہے) میں اس بات کی زیادہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ اسکے جملوں پر تحقیق اور مطالعہ کیا جائے۔

یہ تمام باتیں جو ہم نے عرض کیں' اور جن کے بارے میں اختصار کے ساتھ مثالیں پیش کیں' اِن سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم نے ختمِ نبوت کے بارے میں جس چوتھے رکن پر گفتگو کی ہے اُس میں ہم اس نکتے کی جانب توجہ دیں کہ علما اور اسلامی محققین کو فکری جمود کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور اُن کا طرزِ فکر یہ نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن اور پیغمبر اکرم کی سنتِ قطعی کے بارے میں جو کچھ اسلاف نے کہا ہے بس وہی {حرفِ آخر} ہے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ جو کچھ بعد میں آنے والے کہیں گے وہ مجموعی طور پر زیادہ حقائق {کا حامل} ہوگا' کمتر کا نہیں۔ البتہ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ بعد میں آنے والے کہتے ہیں' وہ پہلے والوں کی کہی ہوئی تمام باتوں سے بہتر ہے۔ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ طبیعت (Nature) میں بھی ایسا نہیں ہے' وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دوبارہ پرانی باتوں کی جانب پلٹا جاتا ہے۔ ممکن ہے ایک نظریہ دو ہزار سال پہلے سامنے آیا ہو' اور اسکے بعد منسوخ ہو گیا ہو' لیکن دو ہزار سال بعد پھر ایک نئی آب و تاب کے ساتھ ابھرا ہو۔

توحید کے دلائل اور قرآن

ابھی پچھلے ہی دنوں خود ہمارا ایک موضوع سے سامنا ہوا' اور ہم اسکی جانب متوجہ ہوئے۔ ہم توحید کے دلائل کے بارے میں غور و فکر اور مطالعے میں مصروف تھے۔ اِس سے پہلے ہم نے فخر رازی کی تفسیر میں ایک نکتہ دیکھا تھا' جس نے ہماری توجہ کو مبذول کیا تھا' کیونکہ ہم نے متکلمین اور

حکما کی کتب میں اِس قسم کا کوئی بیان نہیں دیکھا تھا' اور خود فخر رازی کی کلامی اور فلسفی کتب میں بھی اِس قسم کا کوئی بیان نہیں پایا جاتا' انہوں نے صرف اپنی تفسیر میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی کی تفسیر کے ضمن میں یہ نکتہ تحریر کیا ہے' لیکن اختصار کے ساتھ۔ ظاہر ہے اُن کا یہ نکتہ قرآن کی روشنی میں ہے۔ فخر رازی یوں کہتے ہیں کہ: قرآن میں خدا کے وجود کے بارے میں مخلوقات کے توسط سے دو صورتوں سے استدلال کیا گیا ہے' اور درحقیقت مخلوقات کے ذریعے توحید پر قرآن نے دو استدلال کیے ہیں: ایک اتقانِ صنع کے ذریعے' یعنی موجودات کی ساخت میں موجود نظامِ مشہود کے ذریعے سے۔ جس طرح حکمت کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہر عمارت اپنے بنانے والے کی حکمت اور تدبیر پر دلالت کرتی ہے' یعنی اِن مخلوقات کی خلقت اور اِن کے کل پرزوں میں جو تنظیم ملحوظ رکھی گئی ہے' اُس سے ایک مدبر کے وجود کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس بارے میں اتنی زیادہ آیاتِ قرآنی موجود ہیں کہ گواہ کے طور پر انہیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ قرآن میں موجودات کی ہدایت کے موضوع کے ذریعے سے {توحید پر} استدلال کیا گیا ہے' اور اس استدلال کو اصولِ خلقت سے جدا رکھا ہے' اور وہ چند آیات بھی نقل کرتا ہے' مثلاً فرعون کو خطاب کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی یوں نقل کرتا ہے کہ: قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ. (۱) ہمارا پروردگار وہی ہے جس نے ہر چیز کو اس طرح خلق کیا ہے جیسے اسے ہونا چاہیے تھا۔ جو کچھ اسکے لیے ضروری تھا وہ اسکی خلقت میں اسے عطا کیا ہے۔ یہاں تک اتقانِ صنع سے استدلال ہے۔ اسکے بعد کا جملہ یہ ہے: ثُمَّ هَدٰی. اسکے بعد اسکی ہدایت اور رہنمائی کی۔ یعنی اسے خلق کرنے اور جیسا اسے ہونا چاہیے ویسا بنانے کے بعد اسکی ہدایت کی۔ لفظ "هَدٰی" کو لفظ "ثُمَّ" کے ذریعے اسکے ماقبل سے جدا کیا ہے۔

سورۂ سبح اسم میں فرماتا ہے: اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی. (۲) پس

۱۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۵۰ {ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شئے کو اُسکی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے}

۲۔ سورۂ اعلیٰ ۸۷۔ آیات ۲'۳ {جس نے پیدا کیا ہے اور درست بنایا ہے جس نے تقدیر معین کی ہے اور پھر ہدایت دی ہے}

یہاں بھی ہدایت کا تذکرہ علیحدہ سے فرمایا ہے اور اُسے خَلق و تدبیر سے جدا کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے فرماتا ہے: اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ. (۱) خصوصیت کے ساتھ انسان کے بارے میں بھی انسان کی ہدایت کا ایک نعمت کے عنوان سے اور ایک عنایت کے عنوان سے اسکی خلقت سے علیحدہ تذکرہ کرتا ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اسکے بعد لفظ "اِقْرَاْ" کے ذریعے جدا کرتا ہے اور فرماتا ہے: اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. (۲) پہلے انسان کی خلقت کا ذکر کرتا ہے اور اسکے بعد انسان کی ہدایت کا۔

فخر رازی کا کلام، جو اُن کا قرآن سے کیا گیا ایک استنباط ہے، میرے لیے غور و فکر کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ {اور میں نے سوچ بچار شروع کر دیا کہ} کیا واقعاً موجودات میں ہدایت کا اصول ان کی تخلیق میں پائے جانے والے نظم کے اصول کے ساتھ ایک ہی بات ہے یا یہ دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں؟ سوچ بچار یہاں تک پہنچی کہ اگر موجودات کی خلقت فلسفی اصطلاح میں مشین کی صورت میں تھی، یعنی اگر خداوندِ عالم نے ان موجودات کو خلق کرتے وقت ایک مکمل اور منظم مشین کی صورت میں خلق کیا ہے، تو ایسی صورت میں لامحالہ اس مشین کو جو کام کرنا چاہیے، وہ واضح ہے اب اسکے کام کے لیے ایک علیحدہ تدبیر کی ضرورت نہیں۔ مثلاً اگر گھڑی ساز ایک گھڑی بنائے، تو اُس نے جو کچھ کرنا ہے وہ بس گھڑی کو بنا دینا ہے اور گھڑی کا منظم طور پر کام کرنا اُسکے گھڑی ہونے کا جبری لازمہ ہے۔ جب اس نظم اور ان کل پرزوں کے ساتھ ایک گھڑی وجود میں آ جائے اور اسے {اس طرح} بنا دیا جائے، تو پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں دو موضوع ہیں: ایک یہ کہ ایک گھڑی انتہائی منظم انداز میں بنا دی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ منظم طور پر اپنا کام کر رہی ہے، کیونکہ اُس کا اس طرح منظم کام کرنا کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے، بلکہ اسکی ایسی منظم بناوٹ کا لازمہ

۱۔ سورۂ شعراء ۲۶۔ آیت ۷۸ {جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور پھر وہی ہدایت بھی دیتا ہے}

۲۔ سورۂ علق ۹۶۔ آیت ۱ تا ۴ {اس خدا کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا ہے، اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی ہے}

ہے۔ایک موٹر کار کی منظم بناوٹ کا لازمہ یہ ہے کہ اگر اسے درست طور پر بنایا گیا ہو اور آپ اس کا بٹن دبائیں اور کار میں ایندھن (Fuel) ہو اور آپ کا پاؤں کلچ پر ہو اور گاڑی کا کنٹرول آپ کے ہاتھ میں ہو تو وہ کار اپنا کام کرے گی۔

دنیائے سائنس کیا کہتی ہے؟ کیا سائنس کی دنیا یہ کہتی ہے کہ یہ کام جو موجودات کیا کرتے ہیں (بالخصوص نباتات' حیوانات اور انسان کی دنیا میں) وہ ان موجودات کی مادّی ساخت کا لازمہ ہے؟ یا اسکے ساتھ ایک دوسری قوت وقدرت جس کے لیے ہمارے پاس ہدایت کے سوا کوئی اور لفظ نہیں اور ایک اور امر موجود ہے جو اس خلق کیے گئے موجود کی اسکے کام میں رہنمائی کرتی ہے؟ اس پوشیدہ امر کو اگر ہم خدا کی طرف نسبت دیں جو موجودات کا مدبر اور مدبر ہے' تو اس کا نام ہدایت ہے' اور اگر خود موجودات کی جانب نسبت دیں' تو اس کا نام عشق' محبت اور تسلیم واطاعت ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْهًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ. (۱)

جی ہاں اِس قسم کی ایک چیز موجود ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اِس کتاب {قرآن} کی منطق انسان کی منطق سے ماوراء ہے۔ پس یہ بے وجہ نہیں ہے کہ وہ انسان کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ: اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ. خود فخر رازی جو یہاں اس بات کو قرآن کی زبانی بیان کرتے ہیں' مجھے یاد نہیں کہ وہ اپنی کسی ایک کتاب میں اس نکتے کا تفصیلی جائزہ لے سکے ہوں۔ جی ہاں: کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ. (۲)

۱۔ سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۱۱ {اسکے بعد اس نے آسمان کا رخ کیا جو بالکل دھواں تھا اور اسے اور زمین کو حکم دیا کہ بخوشی یا بکراہت ہماری طرف آؤ تو دونوں نے عرض کی کہ ہم اطاعت گزار بن کر حاضر ہیں}

۲۔ سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۲۹ {یہ ایک مبارک کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تاکہ یہ لوگ اسکی آیتوں میں غور کریں اور صاحبانِ عقل نصیحت حاصل کریں}

پس ختمِ نبوت کے ارکان میں سے ایک رکن' وہ زبردست صلاحیت ہے جو جدید تحقیقات و مطالعات اور تازہ دریافتوں کے سلسلے میں اسلام کے بنیادی (Primary) منابع اور (اُن میں بھی) پہلے درجے پر قرآنِ کریم کو حاصل ہے' اور یہ وہ چیزیں ہیں جو اس دین کو کہنہ و فرسودہ اور ختم نہیں ہونے دیں گی۔

یادداشت

یادداشت

یادداشت

یادداشت

یادداشت

یادداشت

ہماری مطبوعات

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
چھ تقریریں ولایت کے موضوع پر	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
دنیائے جوان	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فکر و نظر	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فقہ زندگی	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
مہدئ منتظرؑ قیامِ عدل اور غلبۂ اسلام کی امید	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
حضرت علیؑ کی وصیت	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
دوستی اور دوست	
امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟	علامہ ابراہیم امینی، محمد باقر شریعتی سبزواری
حسین ابن علیؑ کا خطاب	محمد صادق نجمی
حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا	محمد صادق نجمی
کلام امام حسینؑ کی چند کرنیں	حجت الاسلام محسن غرویان
نہج البلاغہ اور حیات اجتماعی	شیخ حسن موسیٰ صفار
نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں	رضا فرہادیان
ماہِ رمضان تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کا مہینہ	مجلسِ مصنفین
اسلامی تحریک قرآن وسنت کی روشنی میں	شیخ محمد حسن صلاح الدین
بہترین عشق	جواد محدثی
عباد الرحمٰن کے اوصاف	محمد محمدی اشتہاردی
عبادت و نماز	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
توبہ کیا ہے کیسے قبول ہوتی ہے	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
اسلام اور عصر کی ضروریات	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جہاد	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
معنوی آزادی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
سیرت نبویؐ ایک مطالعہ	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جاذبہ و دافعہ علیؑ	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ائمۂ اہلِ بیتؑ فکری و سیاسی زندگی	رسول جعفریان
خاتمیت	استاد شہید مرتضیٰ مطہری